مؤلف

حضرت عارف باللہ ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ صاحب قدس اللہ سرہ

ادارہ اسلامیات

لاہور - کراچی

پاکستان

صہبائے سخن

عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب نور اللہ مرقدہ

ادارہ اسلامیات لاہور

صہبائے سخن : حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی

باہتمام : اشرف برادران سلّمہم الرحمٰن

سنِ طباعت : مئی ۱۹۸۸ء

ناشر : ادارۂ اسلامیات ۔ لاہور

مطبع : مطبعہ عربیہ ۔ لاہور

قیمت : مجلّد

ملنے کے پتے

ادارۂ اسلامیات ۔ ۱۹۰ ۔ انارکلی لاہور ۲

دارالاشاعت، ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

ادارۃ المعارف ڈاکخانہ دارالعلوم کراچی ۱۴

مکتبہ دارالعلوم، دارالعلوم کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

الحمدللہ! حضرت عارفی قدس سرہٗ کا مجموعۂ کلام "صہبائے سخن" جدید اضافات اور نئی ترتیب کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ ۱۹۸۶ء کی ابتدا کا ذکر ہے جبکہ حضرتؒ نے صہبائے سخن کے ابتدائی صفحات کا مسودہ خصوصی شفقت و عنایت کے ساتھ اس ناچیز کے سپرد کیا اور تاکید فرمائی کہ کاتب کو تلاش کر کے ان صفحات سے کتابت کے کام کا آغاز کر دیا جائے۔ خدا کا کرنا کہ ادھر تلاش کے باوجود کسی مناسب کاتب کا فوری بندوبست نہ ہوسکا اور اُدھر وہ ابتدائی صفحات کچھ ہی عرصہ بعد حضرت نے اس خیال سے واپس منگوا لئے کہ مسودہ مکمل ترتیب کے بعد کاتب کے حوالہ کیا جائے گا۔ لیکن ابھی حضرتؒ اس مجموعہ کو پوری ترتیب نہ دے پائے تھے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اور وہ یہ دنیائے فانی چھوڑ کر اپنے رب سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت عارفیؒ کو اپنے اس مجموعۂ کلام کی طباعت کا جس شدت سے انتظار تھا اس کا اندازہ اس مکتوبِ گرامی سے ہوتا ہے جس میں احقر کے عریضہ کے جواب میں حضرتؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا:

"جی چاہتا ہے کہ اب جلد از جلد ہی شائع ہو جائے، فکر رکھو، اہتمام اور

فکر سے جلد از جلد اس کام کو پورا کرلو۔ مجھے بہت فکر ہے جلد فارغ ہونا چاہتا ہوں۔"
(فروری ۱۹۸۶ء)

حضرت قدس سرہٗ نے اپنی حیات ہی میں یہ مجموعہ ترتیب و تدوین کے لئے حضرت سید حماد رضا صاحب مدظلہم کے سپرد کیا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی مسلسل علالت اور ضعف کے باوجود پچھلے سال ۱۹۸۷ء کے وسط میں اسے مرتب کرکے ہمارے پاس کتابت کے لئے ارسال کیا جس کے بعد کتابت کا کام شروع ہوا لیکن حضرت عارفیؒ کی اصل بیاض سے منقول شدہ مسودہ اور کتابت شدہ صفحات میں بعض ایسی اغلاط رہ گئیں جن کا دور ہونا ناگزیر تھا۔ اللہ تعالیٰ برادرِ عزیز مسعود اشرف عثمانی کو جو عامر رضوانی کے نام سے اپنے ادبی ذوق کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں، جزائے خیر عطا کریں کہ انہوں نے اس مجموعۂ کلام کے اغلاطِ کتابت کی تصحیح اور اصل بیاض کے ساتھ مطابقت و مراجعت میں بہت دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے جناب حماد رضا صاحب مدظلہم اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم سے مسودہ کے بارے میں کئی کئی بار مراجعت کی جس کی وجہ سے کتاب کی طباعت میں تو تاخیر رونما ہوئی مگر اپنی بساط کی حد تک بحمد اللہ تصحیح میں کوئی کمی نہ رہی۔

بہر حال اب عرفان و محبت کا یہ مہکتا ہوا گلدستہ آپ کے سپرد ہے اس سے مشامِ جان معطر کرنا اور دل کی دنیا آباد کرنا آپ ہی کا کام ہے۔

محمود اشرف عفی عنہ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزلیات

صف ۶۵

دورِ اوّل (زمانۂ طالب علمی)

۱۹۱۴ء — ۱۹۲۵ء
کانپور ۔ علی گڑھ ۔ لکھنؤ

غزل — صفحہ نمبر

دورِ ثالث ۱۵۳

۱۹۳۶ء ۔ ۱۹۶۳ء

جونپور ۔ کراچی

(بادۂ باقی)

دورِ آخر

۱۹۶۴ء ـ ۱۹۸۶ء (کراچی)

کلامِ فارسی

پیش لفظ

از جناب علی حمّاد رضا صاحب مدّظلہٗ

للّٰہ الحمد! صہبائے سخن کا دوسرا ایڈیشن ہدیۂ ناظرین ہے۔ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب قدس سرّہٗ کا مجموعۂ کلام "صہبائے سخن" جب ۱۹۶۴ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا تو شعری و ادبی حلقوں میں اس کو بہت کچھ داد و تحسین سے نوازا گیا۔ ہند و پاک کے موقر اخباروں اور رسائل نے مشہور و ممتاز ادیبوں اور تنقید نگاروں کے گراں قدر تبصرے شائع کئے۔ ان میں سے چند تبصرے اور چند کے اقتباسات اس کتاب کے شروع میں دیئے جارہے ہیں۔

اس ایڈیشن میں "صہبائے سخن" کی اکثر غزلیات میں اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے اور صہبائے سخن کے مختلف ادوار کے انتخاب کلام میں سے جن دو دو چار چار اشعار کی پوری غزلیں دستیاب ہوگئیں ان کو بھی اس مجموعہ کلام میں "بادۂ باقی" کے زیر عنوان شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "بادۂ باقی" میں وہ غزلیات بھی شامل کی گئی ہیں جو بچند وجوہ صہبائے سخن میں شامل نہ ہوسکیں۔ یہ اضافی اشعار اُن مختلف بیاضوں اور متفرق یادداشتوں سے ماخوذ ہیں جو صہبائے سخن کی ترتیب و تدوین کے وقت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی فطری بے نیازی کے باعث تسکین میرٹھی صاحب (جنھوں نے صہبائے سخن ترتیب دی تھی اور میرٹھ میں مقیم تھے) کو دستیاب

نہیں ہوئے۔ نیز ۱۹۶۳ء کے بعد کا کلام بھی " بادۂ باقی " میں دورِ آخر کے زیرِ عنوان پیشِ خدمت ہے۔

حق تو یہ تھا کہ یہ مجموعہ کلام حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات ہی میں اُن کے مداحوں کی خدمت میں پیش ہو جاتا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ دراصل عارفیؒ نے اس مجموعہ کلام کی ترتیب و تدوین کا کام احقر کے سپرد کیا تھا مگر اس دوران احقر کی طویل علالت اس مجموعہ کلام کی تکمیل میں تاخیر کی سبب بنی۔

احقر العباد

علی حمّاد عفا اللہ عنہ

مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۸۷ء

تقریظ

از مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان صدر دار العلوم کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخی فی اللہ عارف باللہ محترم ڈاکٹر عبد الحی صاحب دامت برکاتہم کو حق تعالیٰ نے بفیضِ صحبت سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہٗ جو کمالات عطا فرمائے ہیں مجھ جیسے ضعیف الہمت کے لئے بہت قابلِ رشک عطیہ ہیں۔ اُن کا تقویٰ و تقدس اور اخلاص و للّٰہیت تو پہلے سے معلوم و مشاہد ہے۔ یہ بات ابھی کچھ عرصہ پہلے معلوم ہوئی کہ ماشاء اللہ شعر و سخن میں بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے خاص کمال عطا فرمایا ہے۔

آپ کا کلام اگرچہ تغزل کے رنگ میں ہے مگر حافظ شیرازی کے طرز پر معرفت و محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ قلب میں حبِ الٰہی کا ایک خاص کیف پیدا کرنے میں بہت مؤثر ہے جس کا تھوڑے سے مطالعہ میں مجھے خود تجربہ ہوا۔ آپ کا تخلص عارفی ہے مگر کلام پڑھ کر یقین ہوتا ہے کہ آپ شیخ کی نسبت سے عارفی ہیں تو اپنی حیثیت سے عارف بھی ہیں۔ وہ دوست بہت مستحق شکریہ و تحسین ہیں جنہوں نے اس کلام کے مجموعہ کو "صہبائے سخن" کے نام سے بہترین کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ مزین کر کے شائع کیا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب موصوف کو ترقیات ظاہری و باطنی عطا فرما دیں اور عافیت کے ساتھ اُن کے فیض کو زمانہ دراز تک جاری رکھیں۔ واللہ المستعان

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

۱۷ ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

میرے شیخ و مربی عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے لطیف و پاکیزہ مذاقِ زندگی سے نوازا تھا جس میں بشری زندگی کے تمام لوازم و خصائص اعتدال اور موزونیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ یہی موزونیت جسمانی ہو تو عرفِ عام میں حُسن کہلاتی ہے۔ وہی اخلاق و کردار میں رچ جائے تو حسن اخلاق اور اتباعِ سنت بن جاتی ہے اور وہی موزونیت اگر الفاظ کا جامہ پہن لے تو اسی کو شعر و ادب سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت عارفی قدس سرہٗ کی زندگی انہی تین عناصر سے عبارت تھی۔

حضرت نے شاعری کو کبھی پیشے کے طور پر نہیں اپنایا۔ نہ اسے کبھی مشاعروں میں حصولِ داد کا ذریعہ بنایا۔ خود بقولِ حضرتؒ ؎

شاعری ہے میری تنہائی کا اک شغلِ لطیف
اپنی بزمِ دل کا خود ساقی ہوں خود ہوں میگسار

یہ تو نہاں خانۂ دل کے وہ لطیف زمزمے تھے جو بے ساختہ دل میں پیدا ہوتے اور جن کا محرمِ راز صاحبِ دل کے سوا کوئی نہ ہوتا۔ لہٰذا ؎

زیرِ مژگاں ہی رہا سرمایۂ خونِ جگر
یہ وہ آنسو ہی نہ تھا جس کو بہا کر دیکھتے

اسی بنا پر خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کبھی اپنا کلام شائع کرنے کا بھی ارادہ نہیں فرمایا۔ لیکن آپ کے چاہنے والوں میں بہت سے ایسے اصحابِ دل بھی تھے جنہیں اس کلام میں کبھی خود اپنی واردات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی۔ کبھی دل کی دنیا کے مسافروں کے لئے بہت سے نشانِ راہ دکھائی دیتے اور کبھی یوں محسوس ہوتا کہ ؎

؎ ہر ادائے دوست جیسے میرے دل کا راز ہے

لہٰذا ایسے حضرات نے یہ سدا بہار مجموعۂ کلام مرتّب کرا ہی لیا جو پہلی بار ۱۹۶۴ء میں "صہبائے سخن" کے نام سے شائع ہوا۔

اس کلام پر کوئی تبصرہ میرے مقام سے بہت بالاتر ہے۔ اس کے حُسنِ بیان پر نیاؔز فتح پوری مرحوم اور اس کی معنویت پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہم العالی اور حضرت بابا نجم احسن صاحب نگرامی قدس سرہ جو کچھ تحریر فرما چکے ہیں اس کے بعد کچھ عرض کرنے کی نہ ضرورت ہے نہ صلاحیت۔

بس اتنا عرض کرنا ہے کہ "صہبائے سخن" کی پہلی اشاعت کے بعد حضرتِ والاؒ کی زبانِ مبارک سے بارہا مجلسوں میں کچھ نئے اشعار سننے میں آئے جو اس مجموعے میں شامل نہیں تھے۔ کبھی حضرتؒ اسی مجموعے کا کوئی شعر کسی ایسے تصرف یا ترمیم کے ساتھ سناتے جس سے اُس کے حسن و معنویت میں بہت اضافہ ہو جاتا۔ دل چاہتا تھا کہ یہ "وارداتِ تازہ" اس مجموعۂ کلام کی زینت بنیں، اور حضرتؒ اس نقطۂ نظر سے "صہبائے سخن" پر نظرِ ثانی فرما کر اُسے ایک مرتبہ پھر مرتب فرمائیں۔ لیکن درخواست کرنے کی ہمت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ حضرت اپنی تصانیف "اسوۂ رسول اکرمؐ"، "مآثرِ حکیم الامتؒ"، "بصائرِ حکیم الامتؒ" اور "معارفِ حکیم الامتؒ" کی ترتیب میں مصروف و منہمک تھے۔

لیکن اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دَور میں جب آپ ان تصانیف کی ترتیب سے

فارغ ہو گئے اور ضعف بھی بڑھ گیا تو حضرتؒ نے ایک مرتبہ خود فرمایا :

"بھائی ! اب میں بہت تھک گیا ہوں اور اب تفریحی مشغلے کے طور پر صہبائے سخن پر نظرِ ثانی شروع کر دی ہے "

اور اس طرح یہ آرزو بحمد اللہ بر آئی ۔

حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ "صہبائے سخن" میں جو ترمیم و اضافہ فرمانا چاہتے تھے وہ آپ نے اپنے برادرِ نسبتی اور خلیفۂ مجاز حضرت علی حماد رضا صاحب مدظلہم کو سمجھا دیا تھا اور جناب علی حماد رضا صاحب مدظلہم العالی اس کی ترتیب میں مصروف تھے کہ حضرتؒ کا وقتِ موعود آپہنچا ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط ۔

فصلِ گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

حضرتؒ کی زندگی ہی میں میرے برادر زادۂ عزیز مولانا محمود اشرف عثمانی سلمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سے درخواست کی تھی کہ "صہبائے سخن" کا یہ نیا ایڈیشن وہ اپنے "ادارۂ اسلامیات" سے شائع کرنا چاہتے ہیں ۔ اور حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی شفقت اور مسرت کے ساتھ یہ کام انہی کے سپرد کر دیا تھا ۔

حضرت علی حماد رضا صاحب مدظلہم نے یہ مجموعۂ کلام مسودے کی شکل میں عزیزم مولانا محمود اشرف صاحب سلمہٗ کے حوالے کر دیا اور ان کے چھوٹے بھائی عزیزم مسعود اشرف عثمانی سلمہٗ نے اس کی کتابت کی تصحیح اور تزئین کا فریضہ انجام دیا ۔

اب بفضلہٖ تعالیٰ یہ سدا بہار گلدستہ اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لئے حاضر ہے ۔ امید ہے کہ انشاء اللہ تعالےٰ اس میں بہت سے اصحاب دل

کو نہ صرف اپنے ذوق کی تسکین کا سامان ملے گا بلکہ دیدۂ بینا ہو تو اس میں منزلِ طریق وسلوک کے وہ اشارے بھی نظر آئیں گے جن کے سہارے راستے کے نہ جانے کتنے مراحل دیکھتے ہی دیکھتے طے ہو سکتے ہیں ع

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۔

احقر

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳ر محرم الحرام ۱۴۰۸ھ

باب الانتقاد

جناب نیاز فتحپوری

مطبوعہ رسالہ "نگار" پاکستان ماہ اکتوبر ۱۹۶۵ء

"صہبائے سخن" مجموعہ ہے جناب محمد عبدالحی عارفی کی غزلوں کا جو پچھلی نصف صدی میں یعنی (۱۴ء سے ۶۴ء تک) بے اختیارانہ اُن کے قلم سے نکل گئی ہیں اور یہ بے اختیاری والی بات میں نے اس لئے کہی کہ اگر خود جناب عارفی بھی مجھ سے یہ کہیں کہ اُن کی غزلیں کسی قصد و ارادہ کا نتیجہ ہیں تو میں قیامت تک اس بات کو تسلیم نہ کروں گا کیونکہ ان کے "از دل خیزد" ہونے کا علم مجھے خود "بر دل ریزد" سے ہُوا ہے جس سے میں انکار کروں بھی تو دل کیوں ماننے گا۔

شاعری فی الجملہ اپنی جگہ مشکل ہو یا آسان لیکن اس کی وہ مخصوص صنف جسے غزل کہتے ہیں ایسی سخت امتحان گاہ ہے کہ اس سے کسی شاعر کا کامیاب گزرنا صرف فطرت کے فیضان پر موقوف ہے اور یہ دولت و سعادت بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔

یہ بات سب جانتے ہیں اور کہتے بھی ہیں کہ غزل خالص دُنیائے محبت کی

چیز ہے لیکن اس عمومیت میں جب تک کسی تنزیہی کیفیت و لطافت کی خصوصیت شامل نہ ہو صحیح معنیٰ میں غزل وجود میں نہیں آتی اور یہ وہ بات ہے جس کا تعلق نہ تنہا دل سے ہے نہ تنہا رُوح سے بلکہ ان دونوں کی ہم آہنگی سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب عارؔفی صاحب کی غزل گوئی نام ہے صرف اسی ہم آہنگی کا جس میں انہوں نے خدا جانے کتنے نئے آہنگ پیدا کئے ہیں۔

تغزل نام ہے صرف جذباتِ عاشقانہ کے اظہار کا۔ لیکن صرف عاشقانہ کہہ دینے سے بات واضح نہیں ہوتی جب تک کیفیاتِ عشقیہ کے جُزِ اصلی کو سامنے نہ رکھا جائے اور یہیں سے تغزل کی دو راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ایک وہ جسے عرفِ عام میں مجاز کہتے ہیں اور دوسری وہ جسے حقیقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مَیں اسے تصوّف اس لئے نہیں کہتا کہ وہ بھی میرے نزدیک ایک تشنۂ تعبیر ہے اس دنیائے احساسات و تاثرات کی جہاں ؎

جولانکدۂ پرتوِ ماہ اندکتا نہا

اور اسی جولانکدۂ پرتوِ ماہ کا دوسرا نام "صہبائے سخن" ہے۔

اس مجموعہ کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے ایک میں جناب عارؔفی صاحب کے زمانۂ طالب علمی (۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۵ء) کا کلام درج ہے اور اسی کے ساتھ اس کا انتخاب۔ دوسرا حصہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے اور اس کا انتخاب بھی دے دیا گیا ہے۔ تیسرے حصّے میں ۳۶ء سے ۶۳ء تک کی غزلیں درج ہیں اور پھر انہی کا انتخاب۔ لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ ان مختلف زمانوں کے رنگِ تغزل میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً عنوانِ شباب کا کلام ملاحظہ فرمائیے:۔

عارؔفی ہو تو گئے خوگرِ تسلیم و رضا — عشق سے گر نہ ہوا کچھ ہمیں حاصل نہ سہی
کچھ تو ہو جس سے امیدِ دلِ مایوس بندھے — مَیں نے مانا وہ مرے حال سے غافل نہ سہی

اب اس کے بعد ۱۹۶۳ء کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے :۔

جب کبھی وہ اِدھر سے گزرے ہیں — کتنے عالم نظر سے گزرے ہیں
بس گئی ہے فضا میں نکہتِ حُسن — وہ جہاں بھی جدھر سے گزرے ہیں
کتنے دلکش ہیں اُن کے نقشِ قدم — جو تری رہ گزر سے گزرے ہیں
نت نئے حُسنِ یار کے جلوے — میری شام و سحر سے گزرے ہیں
دل پہ اک تازہ چوٹ کھائی ہے — جب بھی ہم اُن کے در سے گزرے ہیں

اس غزل کا مطلع تو خیر ملہمات سے تعلق رکھتا ہے لیکن باقی اشعار کو دیکھئے تو بھی آپ کو کوئی خاص فرق ان کے ابتدائی و انتہائی رنگ میں نظر نہ آئے گا اور غالباً یہی وہ فطری خصوصیت ہے جسے دُنیائے تصوّف میں "اولی ما آخر ہر منتہی" کہا جاتا ہے۔

یوں تو عارفی کے مختلف زمانوں کا رنگِ تغزل اپنے جذبات کی پاکیزگی و تاثرات کی گہرائی، اسلوبِ بیان کے ترنّم اور حلاوتِ زبان کے لحاظ سے یکساں نظر آتا ہے۔ لیکن بہت غور سے دیکھنے کے بعد یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ وہی چیز جو پہلے اُن میں صرف ربودگی و وارفتگی تھی بعد میں اِس کی لذت کا احساس تیز تر ہوتا گیا اور اس نے یہ رنگ اختیار کر لیا ؎

کچھ یہی محسوس ہوتا ہے وفورِ شوق میں
ہر ادائے دوست جیسے میرے دل کا راز ہے

غالب تو صرف تقریر کی لذت میں کھو گئے اور محبوب کی بات ان کو اپنے دل کی بات معلوم ہونے لگی۔ لیکن عارفی نے ہر ادائے دوست کو اپنے دل کا راز کہہ کر اس خیال کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

عارفی کے کلام کی وہ خصوصیت جس سے ان کا کوئی شعر خالی نہیں اس کا

والہانہ لب و لہجہ ہے جو اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتا جب تک "دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی"، اور یہ زخم عارفی کے دل میں مجھے بہت گہرا نظر آتا ہے گویا "ایں سینہ ہمہ بدوختن رفت"

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں عارفی کی شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں بلکہ صرف وہبی یا عطیۂ فطرت ہے۔ اور بقول غالب ؎

شعر خود خواہش ایں کرد کہ گردد فن ما

لیکن یہ بات بھی ہم صرف عارفی کے ابتدائی دورِ شاعری کے متعلق کہہ سکتے ہیں ورنہ بعد میں جب انہوں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کیطرف دستِ ارادت بڑھایا تو اُن کی توجّہ کے فیضان سے رنگ کچھ اور نکھر گیا اور ایسا ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اب تو صورت یہ تھی ؎

یوسفے ہست دریں گوشۂ زنداں ما را

اور ان کی وجدانی شاعری نے عجیب و غریب روحانی پاکیزگی حاصل کر لی۔ گویا "چو بوئے گل نبود گرد کاروانِ مرا" چنانچہ آپ عارفی کا سارا کلام پڑھ جائیے کوئی ایک مثال بھی پستیٔ ذوق کی نہ ملے گی۔

نہ وہاں "شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں" ہے نہ رقیب و اغیار کا ذکر، نہ وہاں ہنگامۂ آہ و زاری ہے نہ طوفانِ اشکباری بلکہ تفسیر ہے محض اُس جذبہ کی جسے بیدؔل نے یوں ظاہر کیا ہے ؎

می سوزم و از سوختن خود خبرم نیست

اور خود عارفی نے اس کی یوں تعبیر کی ہے ؎

آشفتہ دلی ہے نہ وہ شوریدہ سری ہے
پھر بھی مگر اک آگ سی سینہ میں دبی ہے

محبت کی وہ منزل جب اس کا احساس ظاہری صرف باطنی کیفیات میں تبدیل ہو جاتا ہے بڑی عجیب و غریب منزل ہے جہاں پہنچ کر شاعر کی زبان اور اس کا لب ولہجہ یکسر الہامی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کی ایک غزل کے چند اشعار سُنئے ؎

نہ کریں آپ مرے دل کا مداوا نہ کریں | پرسشِ غم سے مگر حشر تو برپا نہ کریں
وجہ آشوب دل وجاں ہے محبّت میں یہی | ہو سکے ہم سے تو ہم کوئی تمنّا نہ کریں
اب تو کچھ پاس محبّت کا تقاضا ہے یہی | ان سے ہم پاسِ محبّت کا تقاضا نہ کریں
پاس پیمانِ وفا شرطِ مروت ہے ضرور | میری خاطر مگر آپ اس کا ارادہ نہ کریں

یہ ہے تغزل کا وہ رنگ جس کا تعلق جذباتِ محبّت سے زیادہ دراصل آدابِ محبت سے ہے۔ میرؔ کہتا ہے "عشق بن یہ ادب نہیں آتا" اور یہ ادب کیا ہے اسی کی صراحت عارؔفی نے اپنے اشعار میں کی ہے جسے اصطلاحاتِ صُوفیا میں "جیب تمنّا تہی" کہتے ہیں۔ تمنّاؤں کا اظہار تو سب ہی کرتے ہیں لیکن ترکِ تمنّا کو عین تمنّا قرار دینا عاشقانہ جذبات کی نزہت و پاکیزگی کا وہ درجۂ بلند ہے جو مشکل ہی سے کسی کو حاصل ہوتا ہے اور عارؔفی کی شاعری تمام تر اسی جذبۂ بلند پر قائم ہے جسے دوسرے الفاظ میں انہوں نے اس طرح ظاہر کیا ہے :-

جس جگہ معراج ہوتی ہے جنونِ شوق کی!
ہے مقاماتِ محبت میں مری منزل وہی

اب یہ عالم ہے ذرا بھی جب کبھی خلوت ہوئی
پھر وہی جانِ تصوّر پھر حدیثِ دل وہی

عارؔفی اب تک وہی میرا مزاجِ عشق ہے
پاسِ ضبطِ غم وہی سوز و گدازِ دل وہی

عاصی کے کلام کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا وہ خوشدلانہ جذبۂ تسلیم و رضا اور شعار ضبط و تحمل ہے جو دنیائے محبت میں بہت کم کسی کو حاصل ہوتا ہے اور کسی شاعر کا اپنی شاعری کی تمام بنیاد اسی جذبۂ بلند پر قائم کرنا اور اس سے نہ ہٹنا بڑی نادر الوقوع بات ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سوزِ نہاں سے پھونک دوں قلب و جگر مگر نہیں
اپنے مقامِ ضبط کی کیا مجھے کچھ خبر نہیں

جو کچھ بھی ہو انجامِ گدازِ غمِ پنہاں
فی الحال تو کچھ باعثِ تسکین یہی ہے

نہ ممکن ہو سکی تکمیلِ شرحِ مدّعا مجھ سے
بہت عنوان بدلے لاکھ اندازِ بیان بدلا

میرا مذاقِ عشق ہے خاموش سوزِ غم
مَیں فطرتاً ہوں شورشِ آہ و فغاں سے دُور

محبت میں یہ امّیدِ وفا اچھی نہیں اے دل
کہیں ایسا نہ ہو بڑھ کر خود اک آزار ہو جائے

اسی سعیِ ضبطِ غم سے دِل زار ہو گیا خُوں
کہیں آ نہ جائے لب پر کوئی آہ والہانہ

بہت یاد آتا ہے عہدِ تمنّا
مگر بھول جانے کو جی چاہتا ہے

ناشناسِ چشم و لب بیگانۂ شرح و بیاں
مضطرب سا اک تقاضائے محبت دِل میں ہے

ہر شعر اپنی جگہ ایک مستقل درس ہے انہیں آدابِ محبت کا ایسے مؤثر و پاکیزہ

لب ولہجہ میں کہ " ایں جا از نم یک جبرمی ریذند کوثر ہا "

عاصی فی کے کلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ شورش و ہنگامہ سے بالکل پاک ہے۔ ان کا تغزل فراز کوہ سے گرنے والی آبشار نہیں بلکہ ایک مُسطح زمین پر بہنے والی جوئبار ہے جو ایک ہی رفتار سے جاری و ساری ہے اور اس کے ترنم سے فضا معمور ہو رہی ہے۔ مثلاً ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

بے محابا جب تصور میں کوئی آجائے ہے
پھر نہ تڑپا جائے ہے دل سے نہ سنبھلا جائے ہے

جب کبھی آتا بھی ہے ترکِ تمنّا کا خیال !
شوق دل میں اور اک شعلہ سا بھڑکا جائے ہے

کیا کروں ہنگامۂ عالم میں تدبیرِ سکوں
اب تو دل اس کے تصور سے بھی گھبرا جائے ہے

جس قدر تھکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں قدم
اعتبارِ قربِ منزل اور بڑھتا جائے ہے

جس نے سمجھا ہو جنونِ شوق کو رازِ حیات !
عاصی فی کیا اور بھی کچھ اس سے سمجھا جائے ہے

مَیں جب اس غزل کو پڑھتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آواز اس دنیا سے دُور کسی اور عالم سے آ رہی ہے اور مَیں اس میں کھویا جا رہا ہوں۔

" ایں آتشِ نیرنگ نسوزد ہمہ کس را "

عاصی فی کا کلام پڑھنے کے بعد ایک نقاد کے لئے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ وہ اس کے مدارج و مراتب کیونکر متعین کرے اس لئے مَیں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نقد و تبصرہ تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جناب عاصی فی نے اس کی

کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی بلکہ محض اعتراف ہے ایک ایسی حقیقت کا جس کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں اور اس بات پر مجھے تھوڑا سا فخر بھی حاصل ہے کیونکہ عارفی میرے ایک عزیز ترین مرحوم دوست کے فرزند ہیں اور خوش قسمتی سے آج میں اور وہ دونوں ایک ہی سرزمین میں سانس لے رہے ہیں۔ خدا انہیں تادیر سلامت رکھے۔

عارف کے جدامجد مولوی کاظم حسین صاحب فارسی کے بڑے جید شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں تو اُن کا کوئی نظیر نہ تھا۔ مجھے بھی اُن کا فخرِ نیازمندی حاصل تھا اور ان کے فارسی مجموعۂ کلام نشیدِ کاظم سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

جناب عارفی کی اردو شاعری تو خود اُن کا ذاتی ذوق ہے لیکن مجھے بڑی خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ وہ اپنے دادا کے فارسی ذوق کے بھی حامل ہیں اور چند غزلیں فارسی کی بھی اس مجموعہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار آپ بھی سُن لیجئے۔ وَلِلّٰہِ دَرُّ مَنْ قَالَ

می دہد حسنش فریبِ نوز پیمانِ دگر
می کند عشقم نثارش عالم جانِ دگر

در غم تو می تپد دل بے نیازِ سوز و ساز
روح را بالیدہ می دارم بہ وجدانِ دگر

می نماید نفس حیلہ ساز نیرنگِ ہوس
توبہ ام از جا رود در ذوق عصیانِ دگر

از نگاہ کم مبیں اے منعم ظاہر پرست
بے سر و سامانیم را ہست سامانِ دگر

عارفی پیرِ مغانم بادۂ غم سوز داد
یافتم از کیفِ آں روحِ دگر جانِ دگر

اس مجموعہ کا آغاز جناب محمد نجم احسن بی اے ایل ایل بی۔ نگرامی کے تعارف سے ہوتا ہے جو میرے بھی قدیم کرم فرما اور "نگار" کے اوّلین قدر دانوں اور مقالہ نگاروں میں سے ہیں۔ موصوف بھی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ہیں اور جناب عارفی بھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ تعارف لکھنے کا استحقاق ان سے زیادہ اور کس کو ہو سکتا تھا علی الخصوص اس صورت میں کہ "صہبائے سخن" کی اشاعت صرف انہی کی کوشش و اصرار کا نتیجہ ہے اور جناب عارفی کی کم نمائیاں شاید ہی کسی اور کو اس کی اجازت دے سکتی تھیں۔

جناب احسن نگرامی نے اپنے تعارفی نوٹ میں جناب عارفی کے خاندانی حالات اور کوائفِ زندگی پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے ہم کو جناب عارفی کے شاعرانہ رجحانات کی مخصوص نوعیت سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

جناب احسن نے اس مجموعہ کو بڑے شوق و شغف کے ساتھ شائع کیا ہے جس کا ثبوت اس کی غیر معمولی پاکیزہ کتابت و طباعت ہے۔ الغرض ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے یہ مجموعہ اتنا دل کش اور خوبصورت ہے کہ بے اختیار یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے ؎

مانند شعلہ حسن ترا پشت و رُو یکے ست

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں عارفی کے اردو کلام کا انتخاب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ سب کا سب انتخاب ہی ہے۔ تاہم اُن کے چند اشعار یہاں نقل کئے دیتا ہوں تاکہ آپ بھی خود ان کی پاکیزگیٔ فکر کے متعلق

کوئی رائے قائم کر سکیں ؎

ہے دل دیوانہ اپنی دُھن میں سرگرم طلب
تلخیٔ حاصل وہی ہے سعی لاحاصل وہی

———— ... ————

کیا کوئی حقِ محبّت ہو بھی سکتا ہے ادا
اپنا سارا دعویٔ پاسِ وفا کہنے کو ہے

———— ... ————

تھی بہت گرم اُن کی محفلِ ناز!
آہ اسے بے خودی کہاں سمجھے ہم
دل کی تنہائیوں کا کیا کہنا؟
آپ ہی آپ سمجھے جہاں سمجھے ہم

———— ... ————

پتہ چلتا نہیں کچھ بے خودی میں
کہ اُن کے پاس ہیں یا دُور ہیں ہم

———— ... ————

مجھے تیرے تغافل نے وہاں پہنچا دیا آخر
جہاں تیری نظر بھی اب بآسانی نہیں جاتی

———— ... ————

ایک بھی تو نہ ہُوا حقِ محبّت پُورا
ہم سمجھتے تھے کہ ہم بھی ہیں وفاداروں میں

———— ... ————

نہ جانے کس ادا سے میری جانب اس نے دیکھا تھا
ابھی تک دل میں تاثیرِ نظر محسوس ہوتی ہے

—— ... ——

للہ الحمد اب یہ عالم ہے کسی کی یاد میں
دیکھتا ہے جو مجھے کہتا ہے یہ دیوانہ ہے

—— ... ——

ہر ذرّہ تیرے کوچہ کا آنکھوں سے لگا لوں
ممکن ہے کسی پر ترا نقشِ کفِ پا ہو

—— ... ——

کیسے ہم اس آستانے سے اُٹھے
دیکھنے والوں سے پوچھا چاہیئے

—— ... ——

سوزِ نہاں سے پھونک دوں قلب و جگر مگر نہیں
اپنے مقامِ ضبط کی کیا مجھے کچھ خبر نہیں

—— ... ——

ذکر تھا اُن کی بزم میں اہلِ وفا کا عارفی
میں انہیں یاد آگیا یہ بھی کمال ہو گیا

—— ... ——

کچھ سکوں کے ساتھ اُن سے کہہ تو لیتے حالِ دل
اے ہجومِ شوق یہ کیا حشر برپا ہو گیا

—— ... ——

دید کے قابل ہے یہ منظر کہ اُن کے روبرو
اہلِ دل، اہلِ نظر کی بے بسی ہوتی ہے کیا

—— ... ——

کیا اب یہاں سے منزلِ مقصود ہے قریب
اک اک قدم پہ پوچھتے ہیں راہبر سے ہم

—— ... ——

نیرنگِ فضائے شام و سحر، یہ جوشِ بہار و نسیمِ گل
ہر منظرِ دل کش فرقت میں دیوانہ بنانیوالا ہے

—— ... ——

کچھ دنوں اور ابھی آنکھ سے ٹپکے گا لہو
نشترِ کاوشِ غم چھیڑ رہا ہے دل کو

—— ... ——

یُوں آج اُن کی یاد میں کچھ بیخودی سی ہے
خود اپنے حال پر مرے لب پر ہنسی سی ہے

—— ... ——

عاشقی اتنی خبر ہے اپنی ہستی کی ہمیں
سُن رہے ہوں جیسے کوئی دُور کی آواز ہم

—— ... ——

کچھ اس طرح دل سے بھلایا ہے مُجھ کو
بہت عمر بھر آپ یاد آئیے گا

—— ... ——

تڑپ سکتا نہ ہو جو پاسِ آدابِ محبّت سے
تم اس مجبور کی بیتابیٔ دل دیکھتے جاؤ

ذرا اے رہروانِ تازہ دم راہِ محبّت میں
جہاں مَیں تھک کے بیٹھا ہوں وہ منزل دیکھتے جاؤ

—— ... ——

جوشِ جنونِ عشق میں جاؤں کدھر کو مَیں
حیرت سے دیکھتا ہُوں ہر اِک رہگذر کو مَیں

مانا جنوں نواز ہے ہنگامۂ بہار
فرصت کہاں اٹھاؤں جو زانو سے سر کو مَیں

—— ... ——

وارفتگیٔ دل کی شاید یہ انتہا ہے
خود اُن سے پُوچھتا ہوں کیا میرا مدعا ہے

وہ آ گئے تو ہوش اب آتا نہیں ہے مُجھ کو
اس انتظار کی بھی آخر کچھ انتہا ہے

—— ... ——

حالِ زار دل پہ ہو ان کی نگاہِ التفات
اب تو یہ حسرت بھی وجہ دردِ سر ہونے لگی

اُس نے دیکھا دل کی جانب ایسے کچھ انداز سے
کائناتِ آرزو زیر و زبر ہونے لگی

—— ... ——

ذرا اے جوشِ غم رہنے دے قابو میں زباں میری
وہ سننا چاہتے ہیں خود مجھی سے داستاں میری

—— ... ——

کس طرح بہلائیں دل کو شامِ ہجراں کیا کریں
آ تصور میں تجھی سے کچھ ترا شکوہ کریں

—— ... ——

پہلو میں آج اپنے دلِ ناتواں نہیں
کیا جانیئے غریب کہاں ہے کہاں نہیں

—— ... ——

عارفی ہو تو گئے خوگرِ تسلیم و رضا
عشق سے گر نہ ہوا کچھ ہمیں حاصل نہ سہی

—— ... ——

تم آ گئے ہو یا ہے تصور نظر فریب
یا جان پڑ گئی ہے مرے انتظار میں

—— ... ——

ذرا اے بیخودی میری مجھے اتنا تو بتلا دے
کہ طے کر کے یہ منزل پھر کہاں ہو گا گذر اپنا

—— ... ——

ہجوم یاس و فرطِ شوق سے راحت نہیں دل کو
قفس میں بھی وہی بیتابیاں ہیں جو تھیں گلشن میں

—— ... ——

تم نے گو بے اعتنائی کی بہت
پھر بھی دل تم کو بہت چاہا کیا

کلامِ عارفیؒ کا تعارف

عُلماء و مشائخ نے ہر دَور میں اسلام کی علمی و عملی خدمت انجام دی ہے اور اپنے ذوق و وجدان اور ذہنی رجحان کے مطابق علم و فن، شعر و ادب، تاریخ و تراجم اور سیر و سوانح کی مختلف شاخوں میں گل بوٹے کھلائے ہیں جن سے علم و فن کی محفلوں میں رونق اور بہار نظر آتی ہے اور مشامِ روح و جاں معطر ہوتا ہے۔

نقطۂ نظر کی صحت، ایمان و یقین کی کیفیت، اخلاص و دلسوزی، علم صحیح و عمل صالح حسنِ مذاق و حسنِ طبیعت ایسی نادر خصوصیات ہیں جو علماء و مشائخ کی علمی و ادبی یادگاروں میں آج بھی تر و تازگی اور بقائے دوام کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں اور اُن کا کام اور کلام پیشہ ور اور روایتی و رسمی عالموں، ادیبوں اور شاعروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ رحمت، سامانِ بصیرت اور مسرت و افادیت کا حامل ہے اور اپنے اندر روح و قلب اور ذوق و وجدان کی بالیدگی، تعمیرِ سیرت و شخصیت، ذہن سازی اور دل افروزی، قوت تاثیر و تسخیر اور جمال و جلال رکھتا ہے۔

دیگر فنون سے قطع نظر صرف شاعری ہی کو مدِ نظر رکھئے اور اہلِ دل شعراء کی ادبی خدمات اور اُن کے دیرپا اور دور رس اثرات پر ایک سرسری نظر ڈالئے تو ایسے بے شمار نام ملیں گے جو اسلامی اور عام ادبیات کی تاریخ میں نمایاں اور ممتاز مقام پانے کے مستحق ہیں مگر چونکہ وہ شعر و ادب کی روشِ عام اور مذاق عوام سے دور تھے اور اپنا مخصوص پیغام رکھتے تھے اس لئے انہیں نظر انداز کیا گیا یا اُن کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسے شعراء میں عہدِ صحابہ میں حضرت حسانؓ بن ثابت،

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، نابغہ جعدیؓ، حضرت کعب بن مالک انصاریؓ، عدی بن حاتمؓ، حضرت علیؓ وغیرہم، بعد کے شعراء میں دعبل الخزاعی، امام شافعیؒ، امام محمدؒ (صاحب موطا) اور عہد اموی و عباسی کے دوسرے اسلامی الفکر شعراء۔ خود ہندوستان کے فارسی گو اور اردو شعراء میں شیخ حسن صغانی، حسن دہلوی نظامی (صاحب تاج المآثر) عصامی (صاحب فتوح السلاطین) شیخ جمالی دہلوی (صاحب سیر العارفین) مسعود سعد سلمان لاہوری، قاضی عبدالمقتدر کندی، شیخ احمد تھانیسری وغیرہ۔ عہد مغلیہ اور اس کے بعد شیخ ناصر علی سرہندی، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، مولانا عبدالجلیل بلگرامی، مرزا مظہر جان جاناںؒ، میر ناصر عندلیب، شاہ محمد اجمل الہ آبادی، شاہ محمد فاخر زائر، مفتی صدرالدین خاں، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، شاہ سعد اللہ گلشن، شاہ نیاز بریلوی، شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری، خواجہ عزیزالحسن مجذوب، وصل بلگرامی، جیسے متعدد نام ہیں جن کا کلام اہلِ دل کے لئے حرزِ جان ہے مگر تاریخ ادب میں ان کی ادبی خدمات کو شایانِ شان اہمیت نہیں دی گئی اور اُن سے دانستہ صرفِ نظر اور چشم پوشی اور اُن کی حق تلفی کی گئی۔ اور آخر کے مشائخ میں حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے خلفاء و مریدین ہیں۔ ان مشائخ کے اثر سے پاکیزہ ادبی ذوق کا نشو و نما بھی ہوا۔ حضرت حاجی صاحبؒ کا اردو فارسی کلام کلیات کی شکل میں محفوظ ہو گیا ہے جو اُن کے بلند پایہ ادبی و عرفانی مذاق کا آئینہ دار ہے۔ مولانا گنج مراد آبادی اپنی محفلوں میں اردو فارسی کے منتخب اشعار بکثرت پڑھتے تھے جن سے لوگ مستفید ہوتے اور اُن کے ذوق کی تربیت ہوتی تھی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کا ادبی ذوق بہت پختہ تھا جس کے نمونے ان کی کتابوں اور تقریروں

میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اُن کا یہ ذوق اُن کے خلفاء و مریدین پر بھی اثر انداز ہُوا اور اُن میں متعدد حضرات صاحبِ دیوان یا کثیر الکلام شاعر بھی تھے مثلاً خواجہ عزیز الحسن مجذوب، وصل بلگرامی، علامہ سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا اسعد اللہ صاحب (ناظم مظاہر علوم) وغیرہم۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے ہی اہلِ ذوق خلفاء میں مخدوم و محترم و مشفق مکرم حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی زید مجدہم کی ذاتِ گرامی ہے جو انگریزی تعلیم یافتہ اور ایک صاحب مطب ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ وجد و حال صوفی، ایک مخلص دردمند انسان اور ایک خوش فکر و خوش گو شاعر بھی ہیں اور ایسے دَور میں (جس میں شعر و شاعر کے معنی ہی بدل گئے ہیں اور شعر و سخن میں رفعت و طہارت کی جگہ ابتذال و پست مذاقی، حقیقت طلبی و حق پسندی کے بجائے مجاز پسندی اور شاہد پرستی، اخلاقی گراوٹ، سوقیت و لایعنیت اور ہر طرح کی بد مذاقی اور تسفّل نے لے لی ہے) خوش مذاقی و بلند فطرتی، عالی ظرفی و بلند نگاہی، حق طلبی و حقیقت سنجی، اخلاص و للّٰہیت، سوز و گداز اور درد و محبت کی پاکیزہ روایات قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اور بڑھاپے میں بھی اُن کی عرفانی شاعری، جوان، پُر کیف، روح پرور اور دل افروز ہے اور صالح خیالات و جذبات، سنجیدہ و چیدہ مضامین، عارفانہ حقائق اور عشقِ حقیقی کی تجلّیات کے لئے بہت ممتاز، قابلِ قدر و تحسین اور لائق تقلید و استفادہ ہے۔ اور اس دَور میں معرفت روحانی و وجدان اور شعری فیضان کا ایک منفرد نمونہ اور اعلیٰ مثال ہے۔ بیشتر غزلوں میں پختہ کار اور مشہور اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ مگر بنظر غائر دیکھا جائے تو حضرت عارفی کا کلام اساتذہ کی غزلوں سے کہیں آگے اور معنویت میں بڑھا ہُوا ہے جس کا سبب اُن کے وہ قلبی

احساسات اور پاکیزہ جذبات ہیں جو اُن کی شخصیت کا حصّہ ہیں۔

اس بلند کلام کو جو وارداتِ دل کی ترجمانی اور سروشِ غیب کی ہم زبانی ہے کسی مقدمہ اور تعارف کی ضرورت نہیں تھی، پھر بھی ایک صاحبِ دل، صاحبِ ذوق عارف کا بسیط مقدمہ شامل کتاب ہے۔ ایسی حالت میں مجھ جیسے آدمی کا کچھ لکھنا "دخل در معقولات" سے بڑھ کر بھی ایک جرأت تھی لیکن تعمیلِ حکم ہی اور اپنی سعادت سمجھ کر یہ چند سطور سپردِ قلم کر دی ہیں ؎

اُن کی شفقت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول کچھ مَیں نے چنے ہیں اُن کے دامن کے لئے

ابوالحسن علی

بمبئی ۱۸ ربیع الانور ۱۴۰۳ھ ہجری

تعارُف

"نقش فریادی ہے کِس کی شوخیٔ تحریر کا"

غالب مرحوم نے اپنی طرزِ نگارش کے متعلق فخریہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ "میں نے وہ طرز ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے۔" غالب کا یہ منثور شاہکار اردوئے معلّٰی عودِ ہندی اور رقعاتِ غالب کے نام سے مزّین بہ طباعت ہُوا۔ ان رقعات کو آپ دیکھیں تو اُن کے ایک مکتوب الیہ منشی نادر حسین صاحب بھی ملیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منشی نادر حسین صاحبؒ علم و ادب میں ایک خاص حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کے خاندان میں ایک روایت یہ بھی چلی آتی ہے کہ غالب نے منشی نادر حسین صاحبؒ سے یہ فرمائش کی تھی کہ اُن کے کلام میں سے منشی صاحبؒ اپنی پسند کے اشعار اشاعت کے لئے منتخب کر دیں۔ منشی نادر حسین صاحب ضلع اٹاوہ صوبہ یوپی کے رہنے والے تھے اور نواب محسن الملک مرحوم کے عزیز بلکہ اعمام میں سے تھے۔ علاوہ وجاہت دنیوی و علمی کے اللہ تعالیٰ نے انہیں نعمت دینی و باطنی سے بھی نوازا تھا۔ وہ مشہور بزرگ حضرت شاہ غلام رسول صاحب رسول نما کانپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص اور مجازین میں سے تھے، ان محترم منشی نادر حسین صاحبؒ کی صاحب زادی ہمارے حضرت عارفی کی دادی تھیں۔

حضرت عارفی کے جدّ امجد مولوی کاظم حسین صاحب بڑے صاحبِ علم، صاحب دل، صاحب باطن اور صاحب تاثیر و تاثّر بزرگ تھے۔ مولوی کاظم حسین صاحب مولانا شاہ ابوالخیر صاحب مجدّدی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید، تربیت کردہ اور مجازین میں

تھے۔ ان کے صاحبِ باطن اور ذی تاثّر ہونے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک بار حضرت حکیم الاُمّت مجددِ ملّت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرّہٗ العزیز کالپی (کاظم حسین صاحب کے وطن (اقامت) تشریف لے گئے اور انہی کے مہمان ہوئے۔ ایک نشست میں حضرت تھانویؒ کے بالکل سامنے مولوی کاظم حسین صاحبؒ بیٹھے تھے اور ان کے پیچھے خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ، حضرت تھانویؒ کے مرید اور جاں نثار خاص بیٹھے تھے مگر کاظم حسین صاحبؒ کو اس کا علم نہ تھا کہ خواجہ مجذوبؒ ان کے پس پشت بیٹھے ہیں۔ حضرت تھانوی کے ملفوظات ہو رہے تھے کہ دفعتًا مولوی کاظم حسین صاحبؒ گھبرا کر بول اُٹھے کہ خواجہ صاحب آپ پیچھے کیوں بیٹھے ہیں؟ حضرت کی توجّہ آپ پر ہو رہی ہے اور مَیں بیچ میں پڑ گیا ہوں، دل میرا بے قابو ہوا جا رہا ہے۔ یہ اُن کے ذی تاثر ہونے کی ایک مثال ہے جو معلوم ہے۔

مولوی کاظم حسین صاحبؒ منشی نادر حسینؒ کے عزیز اور داماد ہی نہ تھے بلکہ علوم مروجہ میں منشی صاحب موصوف کے نظر کردہٗ خاص اور مستفیدین میں تھے۔ مولوی کاظم حسین صاحبؒ کی ایک نایاب اور نادرۂ روزگار تصنیف موسوم بہ اسمی تاریخی "نشیدِ کاظم" ہے۔ یہ کتاب شعر و سخن کے علاوہ تاریخ گوئی کا عجیب و غریب اور عدیم النظیر خزانہ ہے اور ایسا خزانہ کہ اب اس کے بعض حصص شاید آسانی سے سمجھ میں بھی نہ آسکیں۔ مولوی کاظم حسین صاحبؒ کے ایک صاحبزادے علی عباس صاحب مرحوم تھے جو حضرت عارفی کے والد ماجد تھے۔

عارفی کی ولادت ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔ دادا نے پوتے کا نام عبدالحیٔ رکھا اور ان کی پیدائش کی تاریخ ان دعائیہ کلمات کے ساتھ منظوم فرمائی:-

صبحِ صادق روز سہ شنبہ بود از ماہِ نخست	بخت نکو را وقت مبارک شاہد واد عبدالحیٔ
عمرِ طویل و علمِ وسیع و دولت و دینش حق بدہاد	ہشتت بجا تاریخش کاظم فرخ باشد عبدالحیٔ

فجر ہشتم محرم ۱۳۱۶ھ

عبدالحئی کی والدہ ان کی صغر سنی ہی میں انتقال فرما گئیں۔ دادی کی گود نے ماں کی گود کی قائم مقامی کی اور اس طرح عبدالحئی عارفی نے بچپن ہی سے دادا دادی کی آغوشِ شفقت میں بلاواسطہ پرورش پائی۔ شاید دادا کی چشمِ باطن نے پوتے کے امکاناتِ ظاہری و باطنی کو پہلے ہی سے پرکھ لیا اور اس طرح پوتا دادا کی توجہاتِ خاص کا مرکز و مہبط بن گیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد عربی کی ابتدائی صرف و نحو اور فارسی درسیات کی تکمیل مولوی کاظم حسین صاحبؒ کی نگرانی اور براہِ راست تدریس و تعلیم سے ہوئی۔ پوتے نے دادا سے علم بھی حاصل کیا اور علم کی چاشنی بھی پائی اور کاظمی صفائے باطن نے درد اور سوز و گداز کی کیفیات بھی پوتے کی رگ رگ میں پیوست کر دیں۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف توجہ ہوئی۔ اسکولوں کی تعلیم کانپور میں پائی۔ پھر ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ قانون کی سند لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ دس سال تک ضلع ہردوئی میں وکالت کی اور ۱۹۳۵ء میں وکالت ترک کر کے ذریعہ معاش کے لئے ہومیوپیتھک طریقِ علاج اختیار کر لیا اور بحیثیت ہومیوپیتھک ڈاکٹر جونپور میں قیام پذیر ہو گئے۔

عارفی کے جدِّ امجد جناب مولوی کاظم حسین صاحب علیہ الرحمۃ کی محبّت اور توجہاتِ باطنیہ کی بدولت ذوقِ صحیح کے ساتھ سوز و گداز کی جو چنگاریاں غیر شعوری طور پر عارفی کے دل میں پیدا ہو کر دبی ہوئی تھیں اُن کے بھڑکنے اور سلگنے کی صورت یوں رونما ہوئی کہ ۱۹۲۷ء میں حضرت مجدّد تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی خدمتِ بابرکت میں حاضری اور شرفِ انتساب کی دولت حاصل کی اور شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکّی مجدد تھانویؒ کے پیر و مرشد کے ارشادِ اعجازی ؎

راہِ حق تجھ کو اگر مطلوب ہے   دوڑ کر تھانہ بھون کی راہ لے

کا فیضان عملاً ظہور پذیر ہُوا۔ حضرت مجدّد تھانویؒ کی توجہاتِ خاص نے عارفی کو

اضطراراً باطنی طور پر جمال ہی جمال بلکہ یوسف جمال بنا دیا۔

عارفی کی یہ آن اور شان اور پیر و مرشد سے تعلق کا تاثر و انفعال اُن کے کلام سے بے حجاب ظاہر ہوتا ہے بسنہ ۱۹۳۶ء میں ترکِ وکالت کے فوراً بعد مجدد تھانویؒ نے ان کو خلعتِ خلافت اور اجازتِ بیعت سے سرفراز فرمایا۔ تیرہ چودہ سال سے عارفی کا قیام کراچی میں ہے اور ان کے جسمانی و روحانی مطب دونوں اپنے اپنے دائرہ میں خدمتِ خلق میں سرگرم کار ہیں۔

بقول ایک عارفی دان کے "عارفی کو ابتدائے عمر ہی سے علمی و ادبی ماحول نصیب ہوا۔ چونکہ اکثر افرادِ خاندان کو شعر و سخن سے مناسبت تھی اس لئے عارفی نے بھی اپنے جدِّ امجد کے باطنی سوز و گداز کا تاثر لئے ہوئے اور علومِ فارسیہ سے مناسبت رکھتے ہوئے شعر کہنے شروع کئے مگر نہ کبھی کسی کو بغرضِ اصلاح دکھائے اور نہ تحسین طلبی کے لئے عام طور پر مجمع یا مشاعرہ میں سنائے۔ وہ ہمیشہ اپنے مذاقِ شعری کے متعلق یہ شعر پڑھا کرتے ہیں ؎

وجدانِ دلم ہست زبس نازک و حساس
شعرم نخورد نیشترِ لا و نعم را

اب احقر کا التماسِ احسن ملاحظہ ہو :-

التماسِ احسن

جادۂ سلوک و درویشی کے پیچ وخم کے محرم وعارف، حلم وحیا کے مخزن، متانت وسنجیدگی کے پیکر عارفؔ کے دل میں شعریت اور سوز وگداز کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے سبزہ و برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑ کی چوٹیوں کے بطن اور تہہ میں آتش فشاں مادہ۔ میں ہمیشہ عارفی کا کلام سنتا رہا اور اس قدر محظوظ ومسرور ہوتا رہا جس کی حد نہیں اور ؎

درونِ سینۂ من زخم بے نشان زدۂ
بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ

کا مضمون ہو گیا۔

میرے اس مذاقِ شعر پسندی میں دوسرے احباب کی شرکت نے اور بھی ہمت افزائی کی۔ میں نے چاہا، تجویز کی اور سب احباب نے اس کی تائید کی کہ مرتّب ہو کر کلام حلیۂ طبع سے آراستہ ہو جائے اور جس کو پسند آئے وہ ایک مرتبہ نہیں بار بار اور جب چاہے خلوت وجلوت میں لُطف اندوز ہوتا رہے۔

ہمارے جنت مکاں دوست مجذوب علیہ الرحمۃ (موسوم بہ خواجہ عزیز الحسن غوریؔ) نے کہا تھا اور کیا خوب کہا تھا ؎

ارے کچھ تو مجذوبؔ یاروں کا حق بھی
یہ چھپ چھپ کے پینا اکیلے اکیلے

عارفی صاحب صہبائے سخن چھپ چھپ کر اکیلے اکیلے پینے کی رسم و عادت

چھوڑنے کے لئے کسی صورت سے راضی نہیں ہوتے تھے۔
بقول اُن کے ؎

شاعری ہے میری تنہائی کا اک شغلِ لطیف
اپنی بزمِ دل کا خود ساقی ہوں خود ہوں میگسار

مگر میرے پیہم اصرار سے وہ یاروں کا حق دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس یاران نوازی کی جزائے خیر دے۔

زمینِ سخن کی چمن بندی اور آرائش و تزئین ماہرینِ فن کا کام ہے۔ دیوانوں کے لئے بکھرے ہوئے گیسو بھی اپنے اندر ایک شانِ جمال رکھتے ہیں اور ان کے ذوق و مزاج کے لحاظ سے۔ بقول احقر بنام احسنؔ ؎

کسی بے نظر کو یہ پہچان کیا ہو
کہ وہ زُلف پُرخم ہے برہم نہیں ہے

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے اس کی توفیق ہوئی کہ مَیں اپنی ذمہ داری پر عارفیؔ کے مجموعہ کلام کو منظرِ شہود پر لا رہا ہوں۔

حضرت عارفیؔ کی شانِ محبت نے ایک دوست حقیر اور دوسرے احبابِ کثیر کی دل نوازی پسند فرمائی۔ ان کا یہ شعر دل نوازی، ذوقِ احباب میں ان کے سلسلۂ کلام کا واسطت العقد ہے جب صاحبِ ذوق کی نظر سے یہ کلام گذرے وہ غالبؔ کے اس شعر کو بھی ذہن نشین کرلے کہ ؎

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

"صہبائے سخن" اس مجموعے کا نام ہے اس کی مناسبت سے "شرابِ گلفام سخن (۱۳۸۷ھ)" تاریخی نام ذہن میں آیا اور حضرت عارفیؔ کے انتساب

اور منصب (درسلوک) کے لحاظ سے دوسرا تاریخی نام "نغمۂ محرم" ۱۳۸۳ھ قلب پر اِلقاء ہُوا۔

اینست کہ دل بُردہ بسے ہم چوں منے را
بسم اللہ اگر ذوقِ سخن ہست کسے را

راقم الحروف و خاکسار

محمد نجم احسن' احسن نگرامی

بی اے ایل ایل بی (سابق ایڈووکیٹ)
(مجازِ صحبت حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ)
۱۴ ر جمادی الاول ۱۳۸۴ھ
بمطابق ۲۱ ر ستمبر ۱۹۶۴ء دوشنبہ

مولانا عبدالماجد دریاآبادی

".... عارفی مشاعرہ کے شاعر نہیں.... لیکن اُن کا کلام دیکھ کر آنکھیں کُھل جاتی ہیں اور یہ یقین ہو جاتا ہے کہ شعر و مشاعرہ کی اس ہلڑ بازی میں اب بھی بڑے بڑے جوہرِ قابل پڑے ہوئے ہیں۔ رنگ کلام کہنا چاہیئے کہ بالکل منفرد، حقیقی محبت اور درد و گداز کا ترجمان اور جذبات اور اندازِ بیان دونوں کے اعتبار سے پاکیزہ و شیریں و دلکش، زبان سلیس، شگفتہ۔ ان سطور کے راقم کو تعلق نیازمندی سالہاسال سے حاصل ہے۔ لیکن "عارفی" سے تعارف آج پہلی بار ہوا.... آج اپنی اس بے خبری پر پشیماں ہونا پڑ رہا ہے۔"

(صدق جدید ۲۸ راکتوبر ۱۹۶۶ء)

شاہ معین الدین احمد

مدیر "معارف"

".... ان میں شاعری کا ذوق فطری ہے۔ چنانچہ وہ طالب علمی کے زمانے سے مشق سخن کرتے تھے۔ مگر ابتدا سے ان کا ذوق بلند اور ستھرا تھا۔ اس لئے اس دور کی شاعری بھی رسمی غزل سرائی کے ابتذال سے پاک ہے اور پاکیزہ تغزل کا نمونہ ہے۔ عارف تھانوی سے ارادت کے بعد یہ شراب دوآتشہ ہو کر شراب طہور بن گئی۔ اس دور کا کلام محض شاعری نہیں بلکہ ایک صاحبِ دل کی آواز ہے۔ اس لئے خیالات کی لطافت و پاکیزگی و ارادت قلبی، سوز و مستی، گوناگوں باطنی کوائف سے معمور اور اس کا ہر شعر بادۂ معرفت کا چھلکتا ہوا جام ہے۔ زبان نہایت شستہ و رفتہ، اندازِ بیان شگفتہ اور اشعار ڈھلے ہوئے سکے معلوم ہوتے ہیں۔

(معارف، اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۶۷ء)

جناب شاعر لکھنوی

"صہبائے سخن" کو ایک بار پڑھ کر کئی بار پڑھنے کی تمنا ہوتی ہے۔ ہر مرتبہ خیال کی کچھ نئی گرہیں اور شعور کے کچھ نئے دریچے کھلتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ صہبائے سخن کی غزلوں کا مزاج رسمی فکر سخن اور قافیہ پیمائی پر نہیں بلکہ عشق کی اس تاریخ پر قائم ہے جو جذبات کو اندر ہی اندر تپا کر کندن بنا دیتی ہے۔ یہ غزلیں تمام تر محبت ہی محبت اور وجدان ہی وجدان ہیں۔۔۔
چنانچہ "صہبائے سخن" میں ایک ایسی لذت کا تصور ملتا ہے جسے وجدان و محویت، رنگ و خوشبو اور بے خودی و سرشاری کا "عطر مجموعہ" کہہ سکتے ہیں اور یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر شاعری عبادت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

(ہمدرد صحت ڈائجسٹ، ستمبر ۱۹۶۷ء)

جناب نصر اللہ خاں صاحب

(مدیر حریت)

عارفی صاحب نے اپنے دل میں کائنات کا سارا درد سمیٹ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری آفاقی ہے اور الہامی بھی۔ ان کے یہاں جمال ہی جمال ہے۔ عارفی کی غزلوں میں موسیقیت ہے۔ وہ الفاظ کے فرق مراتب سے واقف ہیں۔ عارفی صاحب کے سلسلہ میں ہم کو بھی بقول جناب نیاز یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ سب قصد و ارادہ کا نتیجہ نہیں ہے۔ عارفی صاحب کی صہبائے سخن میں نہ تو صہبا اُن کی ہے اور نہ سخن اُن کا ہے۔ یہ فطرت کا فیضان ہے۔ یہ دولت ہر کسی کو نصیب نہیں۔

(روزنامہ حریت، کراچی، ۱۸ر دسمبر ۱۹۶۷ء)

ڈاکٹر ایس ایم یوسف، پروفیسر کراچی یونیورسٹی

شاعر عموماً جلوت پسند ہوتا ہے۔ مگر عارفی صاحب روشنیٔ محفل سے گریزاں، خلوت میں آہ کرتے ہیں، اسی کا نام ان کے نزدیک شاعری ہے۔ اپنے غم کی قدر کرتے ہیں اُسے چھپا کر رکھتے ہیں اور غیروں کی نظر سے بچاتے ہیں۔ ضبط غم سے سوز بڑھتا ہے شعور و احساس تیز تر ہو جاتا ہے۔ جذبات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ سب باتیں عارفی صاحب کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں، نہ صرف وفورِ غم ہے بلکہ غم کی لذت اور آسودگی بھی ہے۔

(کراچی ریڈیو سے براڈکاسٹ)

معذرت

عارضی لب پر اگر آ بھی گئی آہ تو کیا
کتنے ہوں گے جو حریفِ غم نہاں ہوں گے

میرے اس مجموعۂ اشعار کو شائع نہ ہونا چاہیئے تھا اور حقیقتاً یہ چیز قابلِ اشاعت ہے بھی نہیں۔ مجھے اپنے جذبات کی خامیوں اور فن و ادب اور خصوصیات و محاسن شاعری سے بے مائیگی کا خود پورا احساس و اعتراف ہے۔ اس لئے مَیں نے ہمیشہ اپنی موزونیت طبع کو اپنے ہی دل کے کیف تک محدود رکھا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ میرے اس آخری دورِ زندگی میں میرے کلام کی تشہیر کا باعث میرے محبِ محترم حضرت مولوی محمد نجم احسن صاحب دامت برکاتہٗ ہو گئے اور اس کی اشاعت کے محرک و منظم میرے عزیز کرم فرما جناب محمد یاسین صاحب تسکین میرٹھی ہیں۔ ان حضرات اہلِ ذوق و سخن سنج و سخن فہم کے پیہم اصرار مخلصانہ کا یہ کرشمہ ہے کہ یہ چیز منظرِ عام پر آ رہی ہے۔

جو بات ہمیشہ مجھ کو طبعاً ناگوار تھی وہ مَیں نے ان حضرات کی محبت و خلوص کی خاطر گوارا کر لی۔ ممکن ہے کہ ادب و فن کے اعتبار سے ان اشعار کا کوئی خاص درجہ نہ ہو اس لئے کسی صاحبِ نظر کو اس کے ظاہری و باطنی نقائص پر مطلع ہونے سے مکدر نہ ہونا چاہیئے۔ ہاں کسی اہلِ دل صاحب وجدان کو دو، چار شعر پسند آ جائیں اور انبساط خاطر کا باعث ہوں تو مقصود حاصل ہے

از شعر مطلب ما ردّ و قبول کس نیست
دیوانہ وار با خود داریم گفتگوئے

مرے نالے ہیں میرے دل کی تسکیں
مجھے مطلب نہیں اُن کے اثر سے

یہ میرے اشعار یہ ضربات قلب بے قرار
ہیں مرے وجدانِ حُسن و عشق کے آئینہ دار

شاعری ہے میری تنہائی کا اک شغل لطیف
اپنی بزمِ دل کا خود ساقی ہوں خود ہوں میگسار

جب ہُوا کچھ کیفِ دل میں کہہ لئے دو چار شعر
پھر بقدرِ ذوق ان کو پڑھ لیا دو چار بار

عمر بھر میں نے چھپایا ان کو مثلِ رازِ دل
کیا سرِ محفل سناتا ماجرائے ناگوار

یہ نوائے تلخ و شیریں یہ فغانِ گرم و سرد
کیوں کسی اہلِ نظر کی طبعِ نازک پر ہو بار

مَیں ہوں جس عالم میں رہنے دے مُجھے اے عارفی
محفلِ اہلِ ہُنر سے دُور اور بیگانہ وار

احقر

محمد عبد الحیٔ عفی عنہ عارفی ناظم آباد کراچی

شعبان ۱۳۸۴ھ

دسمبر ۱۹۶۴ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حمد و نعت

(از حضرت جدِّ امجد مولوی کاظم حسین صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ)

اے نام خوشت زینت عنوان بیانہا
سُبحانک یا ربِّ تقدّس و تعالےٰ

یادِ تو حیاتِ ابدی از پئے ارواح
ذکر تو نشاطِ ازلی از پئے دلہا

فریاد کہ دیگر نتواند کہ بماند
از دیدنت ایں دیدۂ غم دیدہ شکیبا

یک روز نہ بکشاز دلم سوئے خود امروز
گر میفگنی وعدۂ دیدار بفردا

ناچیز گدایانِ ترا دولتِ دُنیا
بیزار محبّانِ تو از خواہشِ عقبیٰ

عشاق ترا کے سر آں بوالعجبیہاست
در صحبتِ خضر آنچہ نمودند بموسیٰ

ہرگز نگراید بہ بہارِ گُل و گلزار
تا ایں دل سودا زدہ شد با تو شناسا

مستانہ بہ تسبیح تو در حالتِ رقص است
ہر ذرّہ کہ بینم ز ثریٰ تا بہ ثُریا

عشاقِ ترا راست بر آہنگ حجازی
مستانہ بریں قول و غزل دل رود از جا

غزل

این عمرِ گران قدر و سبک سیر دریغا — چون موج به دریا شد و چون باد بصحرا
کارم همه بیصرفه که اجرست و نه اجرت — سعیم همه بیهوده که دین است و نه دُنیا
دیگر من و طوفِ حرم کُوئے خرابات — راہے نکشادند چو از طاعت و تقوی
از فیض سحر هر چه تو بینی به نشاطست — بردار سر از خواب که مفتست تماشا
از ساده دلیهائے تو زاهد عجبم نیست — گر میفگنی عشرتِ امروز بفردا
هر چند که از خود برود جلوه اش از دور — خود بین شوی از قربِ بُتِ آئینه سیما
روزی بدعا خواستن از شرطِ ادب نیست — حیف از طلبی وعدهٔ حق را بتقاضا
شد معجزِ پاکیزگیٔ دامنِ یوسف — اُلقُوهُ علی وجه ابی یاتِ بصیرا
سالک که سبکدوش شد از بارِ علائق — یکباره برست از غمِ وز دو غمِ کالا
دانی که کدام اعظم اسمائے الٰهیست — اسمیکه ترا راه نماید به مسمّٰے
در حُجلهٔ خود دید یکے شاهدِ زیبا — چون مردمکِ دیدهٔ دل گشت سُویدا
تا عرضه دهد صُورت حالیکه برو رفت — تشدید کشیدا زه بر اسمِ زکرّیا
یارب که خواصانِ خودت رهبریم کن — تازه بنمائند بسُوئے تو دلم را
خاصانِ تو بسیار ولاکن سرِ خاصان — خود نیست یکے بنگر که فرد آمد و یکتا
آن ناسخِ ادیان و مِلل احمدِ مرسلؐ — کاوردز پیشِ تو بما ملّتِ بیضا
احکام و شرائع که تو دادی و بے آورد — گردن بنهادیم و سَمِعنا و اَطَعنَا

شاهِ دو جهاں باعثِ خلقِ جن و انساں — فخرِ اب و جدبل شرفِ آدم و حوّا
از بسکه تبنگ آمد و بگرفت ز غیبت — دارد دل مدّاحِ حضورِ تو تمنّا
اسمائے خوشت احمد و محمود و محمّدؐ — القاب تو مزّمّل و مدّثّر و طٰهٰ
از ذرّهٔ خاکِ قدمت دیدهٔ اعمیٰ — گر بهره بُرد باید نکشد نازِ مسیحا
اے شانِ رفیع تو رفعنا لک ذکرک — وے قصرِ منیع تو گزین قبّهٔ خضرا
در خلد مطیعان ترا عیشِ مخلّد — در هاویه اعداء ترا مورد و ماوا
خاصانِ خدا را بخدا راز و نیاز یست — رازِ تو فاوحیٰ و نیازِ تو لتشقیٰ
آن کو ز تو گرویده شد از من تزکّیٰ — وآن کو ز تو گردید فقد ساء سبیلا
اے آنکه رضا جوئے ضمیرِ تو فترضیٰ — فتح تو فتحنا و غنائے تو فاغنیٰ
رفتی شبِ اسرا چو سوئے عالم بالا — در سیر فراتر شدی از عرشِ معلّیٰ
انهار گذرگاهِ تو چوں کوثر و تسنیم — اشجار سرِ راهِ تو چوں سدره و طوبیٰ
از نیمهٔ ره از تو جدا ماند رفیقت — رفتی تو فراپیش سپس یکه و تنها
جائیکه رسیدی نرسد هیچ کس آنجا — سرِ منزلت ادنیٰ و دنیٰ و فتدلّیٰ

کاظم بدرت آمده از کرده پشیماں
رحم آر و ببخشائے برین ظلم و اطغیٰ

اے نامِ خوشت زینتِ عنوان بیانہا
سُبحانک یاربِ تقدّس وتعالےٰ

(جدامجدؒ)

صہبائے سخن

محمد عبدالحیّ عارفی

○

یہ مرا وجدانِ فطری، یہ محبّت کی لگن
اس کے ہر احساس میں ہے نشّۂ خمرِ کہن
اس نے بھر دی میرے دل میں مستئ سوز وگداز
عُمر بھر رکھا مجُھے مدہوش صہبائے سخن

(عارفی)

○

عارفی میں اپنی ہی صہبائے دل سے مست ہوں
میری بزمِ بیخودی کے جام و مینا اور ہیں

○

حمد

محو ہوں لطفِ ناز میں تیرے — گم ہوں راز و نیاز میں تیرے
کتنا عالم فریب عالم ہے — حُسنِ عالم طراز میں تیرے
یہ فسونِ نظر، معاذ اللہ — جلوۂ پردہ ساز میں تیرے
چشمِ نظّارہ محوِ حیرت ہے — حُسنِ نیرنگ ساز میں تیرے
شانِ تسخیرِ عالمِ جاں ہے — التفاتِ مجاز میں تیرے
بے نیازی ہی بے نیازی ہے — لطفِ بندہ نواز میں تیرے
اپنی ہستی مٹا چکا ہوں مَیں — عشقِ ہستی نواز میں تیرے

عاؔرفی بھی ہے ایک کشتۂ ناز
عرصۂ ترکتاز میں تیرے

(علی گڑھ سنہ ۱۹۲۲ء)

ہدیۂ سلام

السلام اے رازِ حسنِ زندگی

السلام اے ذکر تو روح رواں — السلام اے یادِ تو جانانِ جاں
السلام اے جلوۂ نورِ احد — السلام اے مظہر ذاتِ صمد
السلام اے مایۂ رازِ حیات — السلام اے وجہ خلق کائنات
السلام اے منشاءِ رب العلیٰ — السلام اے مصدرِ قالوبلیٰ
السلام اے رحمتہ للعالمین — السلام اے ہادیٔ دُنیا و دیں
السلام اے عالم اُمّی لقب — السلام اے سیّد والانسب
السلام اے پیکرِ خلقِ عظیم — السلام اے آیتِ ربِّ کریم
السلام اے عظمتِ حُبِّ اتم — از خُدا جانِ عزیزت را قسم
السلام اے رہبر راہِ صفا — السلام اے مجتبیٰ و مصطفےٰ
السلام اے رونقِ بزمِ زمیں — السلام اے زینتِ عرشِ بریں
السلام اے رازِ حُسنِ زندگی — السلام اے نازِ عجز و بندگی
السلام اے مُونسِ بے چارگاں — السلام اے دستگیرِ بیکساں
السلام اے مامن و ماوائے ما — السلام اے والی و مولائے ما

آنکہ در عقلم نہ گنجد شانِ تُست   در گمانم آنچہ ناید آنِ تُست
این قدر دانم کہ ربّ ذوالجلال   آفریدت منتہائے ہر کمال

یارسول اللہ بر تو صبح و شام
بیشمار از من درود است و سلام

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ
وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ کَثِیْرًا کَثِیْرًا

(جونپور ۳ر نومبر ۱۹۳۳ء)

حریم دوست

وہ نظر آتا ہے دیکھ اے دل سوادِ کوئے دوست
گوشہ گوشہ سے جہاں کے آ رہی ہے بوئے دوست

آج آساں ہو گئی دشواریٔ منزل مجھے
کھینچ لایا مجھ کو میرا جذبۂ دل سوئے دوست

دیکھتا ہوں خواب کوئی یا ہوں اپنے ہوش میں
اے خوشا قسمت کہاں میں اور کہاں پہلوئے دوست

اے وفورِ شوق اتنی فرصتِ نظّارہ دے
جذب کر لوں دیدہ و دل میں بہارِ روئے دوست

کس طرح کوئی سنبھالے دِل کو بزمِ ناز میں
مست و بیخود کر رہی ہے نرگسِ جادوئے دوست

ہائے کتنی جانفزا ہے لذتِ زخمِ جگر
وائے وہ دل جو نہیں ہے کشتۂ ابروئے دوست

ذوق و شوقِ دل کا مدّت سے تقاضا ہے یہی
جان و دل میں جذب کر لوں ہر ادائے خوئے دوست

اس طرح دل میں بسا لوں نکہت گلہائے حسن
پھوٹ نکلے ہر بُنِ مو سے مرے خوشبوئے دوست

عارفی بس اب یہی ہے آرزوئے زندگی
کاش میرا شغل ہو ہر دم طوافِ کوئے دوست

(جونپور ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۳ء)

جذبۂ بے اختیار شوق

محفلِ سوز و گداز غم کو گرمائے گا کون
اہلِ دل کو اپنے دردِ دل سے تڑپائیگا کون

موجزن ہے کس کے دل میں آتشِ سیّالِ غم
مستئ خونِ جگر آنکھوں سے برسائے گا کون

کس پہ طاری ہے جنونِ عشق کی وارفتگی
یُوں زباں پر والہانہ رازِ دل لائیگا کون

عاؔرفی میرا ہی دل ہے محرمِ نازو نیاز
بعد میرے رازِ حسن و عشق سمجھائے گا کون

عاؔرفی از بس ہیں نازک یہ رموزِ حسن و عشق
کون سمجھے گا یہ باتیں اور سمجھائے گا کون

تاثرات

کس درجہ یہ ریائی اندازِ زندگی ہے
میری خودی کا عالم ہمرنگِ بےخودی ہے

احوالِ ظاہری میں پاکیزگی ہے جتنی
اعمالِ باطنی میں اتنی ہی گندگی ہے

میری منافقت سے بدنام ہے طریقت
اظہارِ کمتری میں دعوائے برتری ہے

مانا کہ مِٹ چکے ہیں ظاہر میں کچھ رذائل
لیکن یہ دل ابھی تک آلودۂ خودی ہے

ممکن نہیں کہ پہنچے منزل پہ عمر بھر بھی
اے دل یہی جو تیرا اندازِ رہروی ہے

یوں دیکھنے میں میری حالت ہے مطمئن سی
کس کو خبر کہ دل میں کیسی کشاکشی ہے

رہتی ہے رات دن کچھ بےچین سی طبیعت
ہر وقت دل میں جیسے اک آگ سی لگی ہے

میرے دلِ حزیں کو اب کون دے تسلّی
کس سے کہوں میں جا کر جو دل میں بےکلی ہے

برباد ہو چکی ہے جس طرح عمر ساری
صد حیف اُسی روش پر رفتارِ زندگی ہے

آتا نہیں سمجھ میں کیا کیجئے تلافی
حالانکہ دل کو کافی احساسِ بے حسی ہے

محسوس کر رہا ہوں خود کیدِ نفس اپنا
مجھ بے خبر پہ کیا کم یہ فیضِ مرشدی ہے

تو عارفی بنے گا کیا رہنما کہ خود ہی
واماندۂ طریق و محتاجِ رہبری ہے

(جونپور)

❦

غزلیات

دورِ اوّل

(زمانہ طالب علمی)

۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۵ء

کانپور علی گڑھ ــ لکھنؤ

کیسا عجیب دور تھا عہدِ نشاطِ بے خودی
اب وہ زمانہ عارفی خواب و خیال ہو گیا

کس درجہ حشر خیز غمِ انتظار ہے
آنکھوں کو ہے قرار نہ دل کو قرار ہے

کوئی خلش ہے دل میں نہ اب انتظار ہے
مایوس ہو کے دل کو سکوں ہے قرار ہے

تجھ سے ترے تغافلِ بے جا کا کیا گلہ
دل اپنی آرزوؤں سے خود شرمسار ہے

آئے بھی وہ چلے بھی گئے پا کے بے خبر
اور مجھ کو بیخودی میں ابھی انتظار ہے

اس التفاتِ خاص کا میں لطف کیا کہوں
جس نے دیا ہے درد وہی غمگسار ہے

مجھ کو تو کیفِ بیخودیٔ شوق سے غرض
وہ آئیں یا نہ آئیں مجھے انتظار ہے

میرے جنونِ عشق کی رسوائیاں نہ پوچھ
بے پردہ ہو رہی جو مرا پردہ دار ہے

آتا نہیں سمجھ میں کہ کیا کیجے عارفی
دل کی کچھ ایسی حالتِ بے اختیار ہے

(لکھنؤ ۱۹۲۵ء)

آپ کرنے کو تو بے داد کئے جاتے ہیں
حوصلے دل کے مگر اور بڑھے جاتے ہیں
شکوہ کرتا ہوں تو ہوتی ہے شکایت اُن کو
چپ جو رہتا ہوں شکایت کے مزے جاتے ہیں
مجھ کو کچھ ہوش نہیں ہے مری منزل ہے کہاں
قدمِ شوق مگر ہیں کہ اُٹھے جاتے ہیں
لے چلے سب تری محفل سے مُرادیں دل کی
ہم بھی اک حسرتِ ناکام لئے جاتے ہیں
مدّتیں گزریں کہ جو ہو بھی چکے خواب و خیال
ہم ابھی تک وہی دن یاد کئے جاتے ہیں
یہ نہ سمجھے کہ ہے یہ کم نگہی جانِ وفا
اُن سے ہم شکوۂ اغماض کئے جاتے ہیں
اے نگاہِ کرمِ دوست یہ معلوم نہ تھا
امتحان اتنے محبّت میں لئے جاتے ہیں
خالی ہوتی ہی چلی جاتی ہے بزم ساقی
رِند جتنے ہیں سب اِک ایک اُٹھے جاتے ہیں
کر چلے آپ تغافل کی تلافی کیا خاک
دل کے ارمان تو دل ہی میں رہے جاتے ہیں

زخم ہائے دلِ مایوس تو رِستے رِستے
مَیں سمجھتا ہوں کہ ناسور ہوئے جاتے ہیں

عارفیؔ اپنی ان آہوں میں اثر ہو کہ نہ ہو
اپنے کرنے کا ہے جو کام کئے جاتے ہیں

○

دل سرد ہو چکا ہے غمِ ہجرِ یار میں
جی چاہتا ہے آگ لگا دیں بہار میں

وہ آ گئے ہیں یا ہے تصوّر نظر فریب
یا جان پڑ گئی ہے مرے انتظار میں

اکثر ہجومِ یاس میں اُن کا خیال ہی
تسکین بن گیا ہے دلِ بے قرار میں

ہوش آئے بیخودی سے ذرا بھی اگر مجھے
کرنی ہے شرحِ لذّتِ دردِ جگر مجھے

کچھ دیکھتا مناظرِ نیرنگِ زندگی
فرصت نہ دی کشاکشِ غم نے مگر مجھے

حُسن و وفا کا رہ گیا قصّہ ہی ناتمام
آئی نہ راس زندگیٔ مختصر مجھے

راہِ وفا میں عالمِ تنہا روی نہ پُوچھ
دو گام بھی ملا نہ کوئی ہم سفر مجھے

لے تو چلی ہے ہمّتِ پرواز سوئے گُل
پہنچا ہیں جتنی دُور بھی اب بال و پر مجھے

ہر جلوۂ لطیف پہ سر دھن رہا ہوں مَیں
اچھا دیا ہے تم نے فریبِ نظر مجھے

سب اس میں جھونک دوں خس و خاشاکِ آرزو
کرنی ہے تیز آتشِ سوزِ جگر مجھے

یہ بھی ہے ایک منظرِ حُسنِ خیال دوست
جس حال میں ہوں رہنے بھی دیں چارہ گر مجھے

تم کیا گئے کہ ہو گئی بے کیف زندگی
کچھ اجنبی سے لگتے ہیں شام و سحر مجھے

تم پاس تھے تو دل میں تھا احساسِ زندگی
تم دُور ہو تو کچھ نہیں اپنی خبر مجھے

کیا چیز بن گیا ہوں تغافل سے آپ کے
اب آکے دیکھئے تو ذرا اک نظر مجھے

مجبور کر رہے ہیں کہ سر اپنا پھوڑ لوں
زندانِ اختیار کے دیوار و در مجھے

سُنتا ہوں ہیں مرقّعِ تنویرِ حسن دوست
پھر دیکھنا ہیں غور سے داغِ جگر مجھے

اے شمع تُو نے آخرِ شب بجھ کے توڑ دی
وہ بھی جو ہو چلی تھی امیدِ سحر مجھے

ملتی کبھی جو فرصتِ نظارہ عارفی
کرنی تھی آزمائش ذوقِ نظر مجھے

(لکھنؤ ۱۹۲۵ء)

امتحانِ ضبطِ رازِ عشق کے قابل ہُوا
اللہ اللہ جلوہ گاہِ ناز میرا دل ہوا

فیضِ دردِ عشق سے احساسِ دل حاصل ہُوا
کھُل گئیں آنکھیں مری جب آشنائے دل ہُوا

حشر پر حشر اُٹھائے غمِ تنہائی نے
رنگ بدلا نہ مگر دل کی شکیبائی نے

آستاں پر تھے ترے یوں تو سبھی سر بسجود
مجھ کو رُسوا کیا اندازِ جبیں سائی نے

یاس انگیز بہت تھا اثرِ جوشِ بہار
سر نہ زانو سے اُٹھایا ترے سودائی نے

اِلتفاتِ نگہ ناز پہ اللہ رے خوشی
پا لیا جیسے تجھے تیرے تمنّائی نے

ایک ہی پھول تھا بس گلکدہ حسن میں تو
چُن لیا آنکھوں میں جس کو ترے شیدائی نے

عارفی اب تو ہے دل طالب ہنگامۂ حشر
ایسا وارفتہ کیا ہے غمِ تنہائی نے

(لکھنؤ ۱۹۲۴ء)

دل وہ کیا دل ہے نہ ہو جو آشنائے دردِ غیر
اک ذرا اس درد سے بھی ہو کے لذت گیر دیکھ

کیوں نظر آتے رہے خوابِ پریشاں عمر بھر
اے مآلِ زندگی اس کی ذرا تعبیر دیکھ

—•—

کوئی منکر ہے اے ناموسِ اُلفت زخمِ پنہاں کا
اُٹھانا ہی پڑیگا اب تو پردہ چشمِ گریاں کا

مرے دردِ نہاں کا اب مداوا کر رہے ہو تم
مجھے جب ہوش ہی باقی نہیں احسانِ درماں کا

مری وارفتگی پر تم مجھے تسکین دیتے ہو
تمہیں اندازہ کیا میرے خیالاتِ پریشاں کا

مری مجبوریوں میں رنگِ وحشت آچلا آخر
نتیجہ یہ ہُوا تیرے تبسم ہائے پنہاں کا

فریبِ التفاتِ ناز آخر کس طرح کھاؤں
ابھی تو زخم تازہ ہے تمنّائے پشیماں کا

مرا دل اُن کی خو، پیمانِ الفت، سب کے سب نازک
نہ جانے حشر کیا ہونے کو ہے شوقِ فراواں کا

مری محرومیوں کی بیخودی نے یوں تلافی کی
تصوّر راحتِ جاں کر دیا اُس آفتِ جاں کا

کہاں تک دل رہے خونِ تمنّا کی کشاکش میں
بس اب اے نشترِ غم کھول بھی دے منہ رگِ جاں کا

کسے معلوم حُسنِ پردہ در کی صبر آشوبی
جنونِ عشق پر الزام ہے چاکِ گریباں کا

سُناؤں کیا کسی کو عاؔرفی اور کون سُنتا ہے
بیان دردِ فرقت اور پھر مُجھ سوختہ جاں کا

(الہ آباد نومبر ۱۹۲۴ء)

شکوۂ جور و جفا لب پر نہ آنا چاہیئے
رنج بیدادِ محبت بھول جانا چاہیئے

چار دن کی صحبتِ گل دے گئی لطفِ بہار
اب خزاں آتی ہے اس کے ناز اُٹھانا چاہیئے

مل تو جاتی ہے سکونِ قلب کی دولت مگر
اس کے ملنے کے لئے بھی اک زمانہ چاہیئے

اے دلِ پُر شوق اک موہوم سی اُمید پر
کیوں فریبِ التفاتِ ناز کھانا چاہیئے

آرزوئیں وجہِ ناکامیٔ دل ہیں عارفی
ان حجاباتِ محبت کو اُٹھانا چاہیئے

(۱۹۲۴ء)

یاد ہیں تیرے کرم تیرے ستم یاد نہیں
خوگرِ شکر ہوں میں خوگرِ فریاد نہیں

لب پہ آئی ہو کبھی آہ مجھے یاد نہیں
اتنا کم ظرفِ محبت دلِ ناشاد نہیں

خوب احساس ہے سوزِ غمِ پنہاں کا مجھے
کوششِ ضبط مری کوششِ برباد نہیں

آزماتے ہیں اُنہی کو جو ہیں مخصوصِ کرم
وائے وہ دل کہ جو لذت کشِ بیداد نہیں

چین ہی چین ہے گلشن میں خزاں ہے جب تک
خوفِ گلچیں نہیں اندیشۂ صیاد نہیں

عارفی دل میں اِک احساسِ محبت ہی رہا
دل پہ گزری جو محبت میں وہ کچھ یاد نہیں

(۱۹۲۴ء)

خود فراموش و خود نما ہوں مَیں
کیا کسی سے کہوں کہ کیا ہوں مَیں

آرزو مندِ غم ہے دل میرا
آپ اپنے لئے بلا ہوں مَیں

کس سے کہئے رموزِ حُسن و عشق
جانے تم کیا ہو، جانے کیا ہوں مَیں

ہے مرا دل فریب خوردۂ شوق
اک افسانۂ وفا ہوں مَیں

تم کو ہوتی مری وفا کی قدر
کاش تم جانتے کہ کیا ہوں مَیں

عاؔرفی حالِ دل سناؤں کسے
آپ ہی اپنا ہم نوا ہوں مَیں

(۱۹۶۴ء)

مَیں تصوّر میں اُنہیں دیکھا کیا
ہر نظر میں اک حجاب اُٹھّا کیا

دل کی حالت ہی دگر گوں ہو گئی
نا اُمیدی آہ تُو نے کیا کیا

مَیں تو بے خود تھا حریم ناز میں
اضطرابِ دل نے جو چاہا کیا

ہو گیا برہم مزاجِ حُسن و عشق
مَیں نے اظہارِ تمنّا کیا کیا

تم نے گو بے اعتنائی کی بہت
پھر بھی دل تم کو بہت چاہا کیا

کیوں جنونِ عشق ہوتا پردہ در
موسمِ گل نے مجھے رسوا کیا

آ گئی جب یاد اُن کی عارفی
دیر تک پہلو میں دل تڑپا کیا

(۱۹۲۴ء)

یہی ہے ضبطِ سوزِ غم کا حاصل دیکھتے جاؤ!
مرے پہلو میں اک آتش بجاں دل دیکھتے جاؤ

تڑپ سکتا نہ ہو جو پاسِ آدابِ محبّت سے
تم اس مجبور کی بےتابیٔ دل دیکھتے جاؤ

دلِ مضطر کی آہیں لب تک آ کر لوٹ جاتی ہیں
بیانِ اضطرابِ غم کی مشکل دیکھتے جاؤ

نہ یہ مے کش ہی ہوں گے اور نہ یہ جام و سبو ہوں گے
کوئی دم کا ہے یہ بھی رنگِ محفل دیکھتے جاؤ

رہے گا اب نہ اتنا بھی جنونِ آرزو دل میں
کئے دیتی ہے یاس اس کو بھی باطل دیکھتے جاؤ

ذرا اے رہروانِ تازہ دم راہِ محبّت میں
جہاں مَیں تھک کے بیٹھا ہوں وہ منزل دیکھتے جاؤ

اُٹھی ہے عاؔرفی جو موج گردابِ فنا بن کر!
یہی بن جائے گی آغوشِ ساحل دیکھتے جاؤ

(بریلی ۱۹۲۳ء)

مایوس کر کے آج امیدِ سحر کو مَیں
بھڑکا رہا ہوں شعلۂ داغِ جگر کو مَیں

جوشِ جنونِ عشق میں جاؤں کدھر کو مَیں
حیرت سے دیکھتا ہوں ہر اک رہگذر کو مَیں

لُطف آ رہا ہے کاہشِ غم میں ابھی مجھے
آساں سمجھ رہا ہوں گدازِ جگر کو مَیں

مانا جنوں نواز ہے ہنگامۂ بہار
فرصت کہاں اُٹھاؤں جو زانو سے سر کو مَیں

لے تو چلا ہے ان کی طرف اضطرابِ شوق
لیکن خبر نہیں کہ چلا ہوں کدھر کو مَیں

دل کانپتا ہے آہ کے سوز و گداز سے
محسوس کر رہا ہوں فریبِ اثر کو مَیں

پیشِ نظر ہے جلوۂ جانانہ عارفی
جرأت مگر کہاں جو اُٹھاؤں نظر کو مَیں

(بریلی ۱۹۲۳ء)

٭

وجہ آشوبِ دل وجاں چارہ گر کیا چیز ہے
کاوشِ غم کیا ہے یہ دردِ جگر کیا چیز ہے

دل ہے اور آباد اس میں اک جہانِ آرزو
اُف فریبِ زندگیٔ مختصر کیا چیز ہے

مرنے دیتی ہے نہ جینے دیتی ہے بیمار کو
اے شبِ غم! اُف یہ اُمیدِ سحر کیا چیز ہے

واقعی کیا ان کے خط آنے کا ہے دل کو یقین
اے جنوں یہ انتظارِ نامہ بر کیا چیز ہے

کاوشِ غم سے دلِ پُرشوق جب خوں ہو گیا
اب ہُوا معلوم عشقِ معتبر کیا چیز ہے

دیکھتا اے کاش کوئی اہلِ دل اہلِ نظر
یہ مرا سرمایۂ خونِ جگر کیا چیز ہے

مَیں تو ہوں محوِ خیالِ یار مجھ کو کیا خبر
آرزوئے دل ہے کیا ذوقِ نظر کیا چیز ہے

ہم نشیں مانا کہ دردِ دل میں ہوتا ہے اثر
اب ذرا یہ بھی بتا مجھ کو اثر کیا چیز ہے

زندگی کی اب تو ہر تلخی مزا دینے لگی
عشق میں ناکامیٔ دل بھی مگر کیا چیز ہے

عارفی پاسِ محبّت نے اجازت ہی نہ دی
ورنہ دکھلاتا کہ آہِ بے اثر کیا چیز ہے

(بریلی ۱۹۲۳ء)

اب کر رہے ہو پُرسشِ غم بار بار کیا
میرے دلِ حزیں کا سکوں کیا قرار کیا

آساں ہے ضبطِ راز دلِ بے قرار کیا
اے چشمِ نم بتاؤں تجھے رازدار کیا

ہیں بے خودئ یاس میں بھی بے قراریاں
اللہ جانے دل کو ہے اب انتظار کیا

آخر جنونِ یاس کی یہ شورشیں ہیں کیوں
سر اپنا پھوڑ لے کوئی امیدوار کیا

جو چاہیں وہ کریں یہ مری بے قراریاں
اخفائے دردِ دل پہ مجھے اختیار کیا

ضبطِ جنونِ عشق ابھی سے ہے مضطرب
ڈھائے گی اب کے قہر نہ جانے بہار کیا

دیکھے کوئی تو کیا کہے اے بیخودئ شوق
باتیں یہ دل سے کرتا ہوں دیوانہ وار کیا

مَیں خود حریفِ دردِ محبت ہوں عارفی
ہو کر کرے گا کوئی مرا غمگسار کیا

(بریلی ۱۹۲۳ء)

تھا دل پُر شوق تیرے ناز اٹھانے کے لئے
تُو نے اُٹھوایا ستم گر اس سے بارِ آرزو

غضب کی آندھیاں آئیں ستم کی بجلیاں ٹوٹیں
فقط اس واسطے گلشن میں میرا آشیاں کیوں ہو

نہ کسی سے کوئی مطلب نہ کسی پہ بار اپنا
غمِ ناگوار اپنا، دلِ بے قرار اپنا

مجھے ہوش و بیخودی میں وہی ایک محویت ہے
کبھی انتظار اُن کا کبھی انتظار اپنا

انہیں نازِ بے نیازی مجھے ناز جذبۂ دل
انہیں اعتبار اپنا مجھے اعتبار اپنا

مرے دل سے تم کو آخر کوئی وجہ بدگمانی
تمہیں کیا خبر کہ اس کو نہیں اختیار اپنا

مرا دل یہ کہہ رہا ہے تپش گداز غم سے
انہی بے قراریوں میں ہے کہیں قرار اپنا

نہیں عارفی ذرا بھی کوئی لُطف بیخودی میں
مُجھے یاد آرہا ہے دلِ بے قرار اپنا

(لکھنؤ ۱۹۲۳ء)

دل پُر آرزو وقفِ نیازِ پاسباں ہوتا
تمنّا ہے یہ سر ہوتا اور اُن کا آستاں ہوتا

یہ سب جور و جفا میرے لئے مہر و وفا ہوتے
مزاجِ یار میں گر دخل الطافِ نہاں ہوتا

بہت دلچسپ ہے اپنے دلِ مضطر کا افسانہ
سناتے عارفی اس کو جو اپنا رازداں ہوتا

خواب و خیال میں کوئی تیرے سوا نہ ہو
جس دل میں تُو ہو اُس میں کوئی دُوسرا نہ ہو

ہو جائے فاش رازِ محبّت تو کیا کریں
دل پر جب اختیار ہی باقی رہا نہ ہو

کنجِ قفس میں اپنے نشیمن کا سانحہ
اس طرح سُن رہا ہوں کہ جیسے ہُوا نہ ہو

جذباتِ دل اُبھرتے ہیں دل کی تڑپ کے ساتھ
وہ زندگی ہی کیا ہے جو درد آشنا نہ ہو

ہوتی نہیں ہے باعثِ تسکین عارفی
وہ تشنگیٔ شوق جو حد سے سِوا نہ ہو

(۱۹۲۳ء)

—•—

دیکھ گُلبن پہ نہ رکھ بُلبلِ ناداں تنکے
آتشِ گُل سے نہ جل اُٹھے نشیمن تیرا
آمدِ موسمِ گُل ہے تو مبارک تجھ کو
باغباں ہم تو چلے چھوڑ کر گلشن تیرا

—•—

وارفتگیٔ دل کی شاید یہ انتہا ہے
خود اُن سے پوچھتا ہوں کیا میرا مُدّعا ہے
وہ آ گئے تو ہوش اب آتا نہیں ہے مُجھ کو
اس انتظار کی بھی آخر کچھ انتہا ہے
یہ بات آپ نے بھی محسوس کی ہو شاید
سُنتا ہوں میرے دل کی ہر آہ نارسا ہے
اے آرزوئے مضطر بتلا کہ کیا کہوں مَیں
وہ مجھ سے پُوچھتے ہیں کیا تیرا مُدّعا ہے
کیا ہو گئی ہے میری حالت سے نا اُمیدی
کیوں چارہ ساز مجھ کو تسکین دے رہا ہے
کرتو رہا ہوں کوشش ہر چند ضبطِ غم کی
دل کی تڑپ میں لیکن لذّت ہی کچھ جُدا ہے
مَیں اس خیال ہی سے ہوں عارفی پریشاں
آخر مری محبّت کیوں طالبِ وفا ہے

(علی گڑھ ۱۹۲۳ء)

※

خونفشاں زخمِ جگر سے چشمِ تر ہونے لگی
پردہ دارِ رازِ غم ہی پردہ در ہونے لگی

مَیں نے دیکھا مجھ میں اور تجھ میں نہایت قُرب تھا
رفتہ رفتہ جب مجھے اپنی خبر ہونے لگی

حالِ رازِ دل پہ ہوا اُن کی نگاہِ التفات
اب تو یہ حسرت بھی وجہ دردِ سر ہونے لگی

دیکھ کر میرے دلِ پر شوق کا جوشِ طلب
منزلِ مقصود خود ہی راہبر ہونے لگی

اُس نے دیکھا دل کی جانب ایسے کچھ انداز سے
کائناتِ آرزو زیر و زبر ہونے لگی

عاؔرفی مجھ پر کھلا رازِ طلسمِ حُسن و عشق
زندگی جب سے تحیّر میں بسر ہونے لگی

(علی گڑھ ۱۹۲۲ء)

سر بزانوئے پشیمانی کوئی دلگیر ہے
آہ وہ خوابِ محبّت جس کی یہ تعبیر ہے

کون اُٹھاتا زحمتِ اُمیدواری عمر بھر
مطمئن ہوں مَیں کہ میری آہ بے تاثیر ہے

لے رہا ہے دل مرا کیفِ تحیّر کے مزے
جب سے آغوشِ تصوّر میں تری تصویر ہے

اے اجل دیکھ اب تو مجھ سے جاں دی جاتی نہیں
میری بالیں پر کوئی شرمندۂ تاخیر ہے

عاؔرفی کیا کہئے افسانہ جنونِ عشق کا
اب وہ عہدِ زندگی اک خوابِ بے تعبیر ہے

(علی گڑھ ۱۹۲۲ء)

کس درجہ جنوں خیز ہے پیمانِ تمنّا
مجبورِ تمنّا ہے پشیمانِ تمنّا

میرے دلِ پرشوق میں اے جانِ تمنّا
ہے تیری تمنّا بصد عنوانِ تمنّا

دل ہے یونہی اک شعلۂ بیتابِ محبّت
پھر اس پہ ستم جنبشِ دامانِ تمنّا

اُن کی نگہ ناز ہی شاید نہ کہیں ہو
اک تیر ہے پیوستِ رگِ جانِ تمنّا

اے بے خودیٔ یاس نہ مٹ جائے کہیں آہ
یہ اک خلشِ درد جو ہے جانِ تمنّا

دامن کو ذرا اپنے بچائے ہوئے اے دل
اُلجھے نہ کوئی خارِ گلستانِ تمنّا

کس حال میں ہے تیری تمنّا مرے دل میں
معلوم ہے کچھ تجھ کو بھی اے جانِ تمنّا

اب دل میں ہے اک کیفیت جذبِ محبّت
شوریدگیٔ غم ہے نہ ہیجانِ تمنّا

اے عارفی ہے یہ بھی عجب خوبیٔ قسمت
جو دشمنِ جاں ہے، ہے وہی جانِ تمنّا

(علیگڑھ ۱۹۲۱ء)

جلوہ ہائے عالمِ حیرت سے دل لبریز ہے
اللہ اللہ بے خودی بھی کیا تصوّر خیز ہے
کر رہا ہے تجھ سے باتیں بیخودیٔ شوق میں
تیرے دیوانے کی تنہائی بھی لطف انگیز ہے
دل ہُوا ہے جب سے لذّت گیرِ نشترہائے غم
ہر نفس ذوقِ جراحت میں تپش انگیز ہے

عارفی کیا کیجئے دل کے تغیّر پر نگاہ
اس کے افسانے کا ہر عنواں جنوں انگیز ہے

(علی گڑھ ۱۹۲۱ء)

مرے پہلو میں دل بھی کیا دل ہے
خود ہی قاتل ہے خود ہی بسمل ہے
رہروِ عشق نااُمید نہ ہو
داغِ حسرت نشانِ منزل ہے
کس کا یارب فریب خوردہ ہوں
آہ کس انتظار میں دل ہے

عارفی رائیگاں نہیں غمِ عشق
مجھ کو سب کچھ اسی سے حاصل ہے

(علی گڑھ ۱۹۲۱ء)

مجھی سے سُن لو جو سُننا ہے غم کی داستاں میری
کہاں سے لائے گا پھر کوئی دل میرا زباں میری

ذرا اے جوشِ غم رہنے دے قابو میں زباں میری
وہ سُننا چاہتے ہیں خود مجھی سے داستاں میری

شبِ فرقت مجھے ہے ناز کیا کیا اپنی قسمت پر
تیرا دردِ محبّت اور کرے غم خواریاں میری

مُجھے پھر غم ہی کیا جب اُن کے مُنہ سے خود یہ سُنتا ہوں
کلیدِ کامیابی ہیں یہی ناکامیاں میری

مَیں سمجھوں عاؔرفی سوزِ محبت کام کی شے ہے
دکھائے کچھ اثر اپنا اگر آہ و فغاں میری

(علی گڑھ ۱۹۱۷ء)

آ نہ جائے لب پہ جو رازِ محبّت دل میں ہے
ضبطِ غم کی کش مکش سے دل بڑی مشکل میں ہے

کیا چُھپانے سے کبھی چھپتی ہیں ظاہر داریاں
وہ نگاہوں سے ہے ظاہر جو تمہارے دل میں ہے

منتظر ہو دَورِ ساغر کا یہ کِس کو ہوش ہے
مستِ کیفِ بیخودی ہے جو تری محفل میں ہے

بحرِ بے پایانِ غم میں یاس سے بھٹکی ہوئی
اک شکستہ کشتیٔ دل حسرتِ ساحل میں ہے

گو نہ ہو اظہار اس کا گو نہ پُوچھیں وہ مجُھے
ہے یہی کیا کم کہ میری یاد اُن کے دل میں ہے

عــارفی ممکن نہیں عنواں کوئی اظہار کا
کیا کہوں کس کی تمنّا کیسی حسرت دل میں ہے

(کانپور ۱۹۱۴ء)

فکرِ درمانِ غمِ عشق کیا کرتے ہیں — چارہ گر بھی بڑے نادان ہُوا کرتے ہیں

ہاں مدد جذبۂ دل تیرے سہارے سے مجھے — کھینچنا ہے اُنہیں جو مجھ سے کھنچا کرتے ہیں

ناوکِ ناز ہے یا خارِ تمنّا دل میں — اک خلش رہتی ہے کانٹے سے چُبھا کرتے ہیں

عارفیؔ لب پہ ترے شکوۂ بیداد ہے کیوں
کیا کہیں اہلِ وفا یہ بھی کیا کرتے ہیں

○

اے آہ! کچھ تجھے بھی ہے معلوم حالِ دل
کیا قصد ہے بہ سوختہ ساماں کئے ہوئے
دشوار ہے جو ہو سکے اب ضبطِ اضطراب
اجزائے دِل ہے دردِ پریشاں کئے ہوئے

—•—

کب مجھے عہدِ تمنا کی نہ یاد آئی آہ
کب میں ناکامِ وفا سر بگریباں نہ ہوا
کوئی قائل ہو ترا کس طرح اے سوزِ نہاں
ایک بھی داغ تو سینہ پہ نمایاں نہ ہوا
کوئی کانٹا ترا ایسا نہیں اے دشتِ جنوں
کچھ دنوں تک جو میرے پاؤں کا مہماں نہ ہوا
شمع کی طرح سرِ شام سے دل بھی ہے خموش
عارفی کوئی انیسِ شبِ ہجراں نہ ہوا

٭

اب جو نگاہِ ناز کے قابلِ رحم ہی نہیں
ایسی ہوئی ہے کیا خطا تیرے گناہگار سے

تماشائی ہے اک دنیائے حسرت میری آنکھوں میں
سُنا ہے کاروانِ دل اسی منزل سے نکلے گا

وفورِ شوق نے محروم رکھا بادہ نوشی سے
مرا دستِ تمنّا رہ گیا طوقِ سبُو ہو کر

سُن کے مرا بیانِ غمِ اشک ہیں چشمِ ناز میں
ہائے یہ کیسا سوز تھا دل کے شکستہ ساز میں

دونوں جہاں سے بے خبر محو ہوں سوز و ساز میں
بیٹھا ہوا ہوں سرنگوں ان کے حریم ناز میں

بڑھتی رہیں یونہی اگر حُسن کی بے نیازیاں
پھر مرا عشقِ مضطرب کیسے رہے گا راز میں

اُف رے جنونِ جستجو کھا کے فریبِ رنگ و بُو
ڈھونڈ رہا ہوں میں اُنہیں گلکدۂ مجاز میں

سنگِ درِ حرم پہ ہے محو سجود بے خودی
اُن کا نیاز مند ہے آج مقامِ ناز میں

مانا کہ رازِ حسن اک راز درونِ راز ہے
فتنۂ عشق پردہ در رہنے بھی دے جو راز میں

دیدہ و دل کا جو بھی کچھ حشر ہو کوئی غم نہیں
دیکھوں ہیں کتنی شوخیاں حسنِ ستم طراز میں

کس کو نصیب ہے یہ ذوق کس کو بتاؤں عارفی
کتنا سرور و کیف ہے عشقِ جگر گداز میں

دیکھنے آئے تھے مجھ خستہ جگر کی صورت
قابلِ دید ہے اب اہلِ نظر کی صورت

دل کا یہ حال ہے اب سوزشِ غم سے پیہم
اشک آنکھوں سے نکلتے ہیں شرر کی صُورت

سخت جانی نے کیا سر بگریباں مجھ کو
مُجھ سے دیکھی نہ گئی شمعِ سحر کی صورت

عارفی کیا ہُوا انجامِ محبّت آخر
شکل کیا دل کی ہے یہ کیا ہے جگر کی صورت

○

عمرِ گذشتہ کے منظر میں حشر بپا ہو جاتا ہے
دل جب پچھلی یادوں کو تنہائی میں دُہراتا ہے

اب تو یہی اک شغل ہے اپنا ہجر کی تنہا راتوں میں
مَیں دل کو کچھ سمجھاتا ہوں دل مجھ کو کچھ سمجھاتا ہے

نازک سی شئے ہے غنچۂ دل کیا اس کی خزاں کیا اس کی بہار
بات میں یہ کِھل جاتا ہے اک بات میں مُرجھا جاتا ہے

دل میں جنونِ محرومی کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں
جب عہدِ نشاطِ رنگیں کا افسانہ کوئی یاد آتا ہے

عارفی اس سرگشتۂ غم کا اور مداوا کیا کیجے
جتنی تسکین دیتا ہوں دل اتنا ہی گھبراتا ہے

تجھ کو تلافئ جفا ایک نظر کا کام ہے
دیکھ کہ زخمِ دل ابھی قابل التیام ہے
کیفِ رموزِ عشق سے چاہیئے ایک بےخودی
مشربِ اہلِ ذوق میں آہ و فغاں حرام ہے
کیا کروں ہم نشیں بتا تھمتی نہیں جو چشم تر
بادۂ غم ہے جوش میں اور شکستہ جام ہے
دیکھ سکوں نہ گر انہیں میری نظر کا ہے قصور
ورنہ ہر ایک رنگ میں جلوہ تو اُن کا عام ہے
جن کو نہیں مری خبر بھولے ہوئے ہیں جو مجھے
دل میں انہی کی یاد ہے لب پہ انہی کا نام ہے
کھویا ہوا ہوں اس قدر حال میں اپنے عارفی
یہ بھی نہیں مجھے خبر صبح ہوئی کہ شام ہے

بیٹھا ہے تھک کے پہلی ہی منزل کے سامنے
ہیں مرحلے ابھی تو بہت دل کے سامنے

طوفانِ غم نے کس کا سفینہ ڈبو دیا
موجیں جو سر پٹکتی ہیں ساحل کے سامنے

راہِ وفا میں رکھنے کو رکھ تو دیا قدم
دنیائے پیچ و تاب ہے اب دل کے سامنے

خلوت میں ہے نصیب مجھے لطفِ انجمن
بیٹھا ہوں سر جھکائے ہوئے دل کے سامنے

بسمل کی حسرتوں کا تو خوں اے اجل نہ کر
دم بھر تڑپ تو لینے دے قاتل کے سامنے

آئینہ ہاتھ میں لئے شرما رہے ہیں وہ
اٹھتی نہیں ہے آنکھ مقابل کے سامنے

دل وہی مشکل ہے اب اے بے وفا تیرے لئے
توڑنا دل کا مگر آسان تھا تیرے لئے

صبحِ شامِ غم تو ہو وہ صبحِ محشر ہی سہی
یہ بھی اے سوزِ نہاں مشکل ہے کیا تیرے لئے

میری قسمت میں ہے تُو اے دل تری قسمت میں غم
اک بلا میرے لئے ہے اک بلا تیرے لئے

باز آ درمانِ دردِ دل سے اے بیمارِ غم
زہر ہے اب زہر ناداں ہر دوا تیرے لئے

نا امیدی نے دلِ مضطر تسلّی دی تو ہے!
اور اب کیا چاہیئے اس کے سوا تیرے لئے

شکوۂ بے مہریِ احباب ہے کیا عاؔدفی
کوئی آخر کیوں ہو پابندِ وفا تیرے لئے

یہ بھی اعجاز ہے ساقی ترے مے خانے کا
دل بہکنے نہیں پاتا کسی مستانے کا
ہجر کا عالم تنہائی بھی کیا عالم ہے
لطف مرنے کا نہ احساس جیئے جانے کا
بہہ گیا اشکوں میں جو خون تھا دل میں باقی
چارہ گر کو ہے گماں زخم کے بھر جانے کا
اپنی ہستی کی حقیقت ہے فقط خواب وخیال
زندگی نام ہے بھولے ہوئے افسانے کا
عاؔدفی غفلتِ ماضی کی تلافی نہ ہوئی
دل کو صدمہ ہے یونہی وقت گزر جانے کا
عاؔدفی اس طرح اب دل میں ہے احساسِ حیات
جیسے عالم ہو چھلکتے ہوئے پیمانے کا

—•—

دیکھ کر جوشِ طلب میرے دلِ پُرشوق کا
منزلِ مقصود خود ہی راہبر ہونے لگی !

ہے لطف خموشی میں نہ آہوں میں مزہ ہے
بے کیفیٔ دل ان دنوں کچھ حد سے سوا ہے

جائز نہیں اندیشۂ جاں عشق میں اے دل
ہشیار کہ یہ مسلکِ تسلیم و رضا ہے

پہنچا دیا مجھ کو یہ کہاں جوشِ طلب نے
رہبر ہے جہاں کوئی نہ منزل کا پتا ہے

اب اس میں تڑپنے کی سکت ہی نہیں باقی
کیوں دل کو مرے نشترِ غم چھیڑ رہا ہے

اے دوست مَیں کیا محویتِ دل کو چھپاؤں
جب حسنِ تصور بھی ترا ہوش ربا ہے

کچھ دیر کو آئے تھے تصور میں وہ لیکن
اب تک دلِ پرشوق میں اک حشر بپا ہے

اک ربطِ محبت ہی کا احساس ہے دل میں
کچھ اور نہ احساس جفا ہے نہ وفا ہے

بے خود کئے رہتی ہیں تصور کی فضائیں
اپنی شبِ تنہائی کا عالم ہی جدا ہے

فطرت کی عطا ہیں مرے جذباتِ محبت
اندازِ تغزل ہی مرا سب سے جُدا ہے

مَیں عارفی اب اپنے ہی دل سے ہوں پشیماں
اب مجھ کو شکایت ہے کسی سے نہ گِلہ ہے

کوئی حریفِ گدازِ نہاں نہیں ملتا
مذاقِ غم کا مجھے رازداں نہیں ملتا

سبک خرام ہے کس درجہ آہ عمرِ رواں
نشانِ گردِ پسِ کارواں نہیں ملتا

مریضِ ہجر کو شرحِ گدازِ غم کے لئے
سوائے شمع کوئی ہم زباں نہیں ملتا

سکونِ قلب کہاں ہے کہیں نہیں اے دل
کہ جان دے کے بھی یہ تو یہاں نہیں ملتا

برنگِ شمع ہزاروں ہوں سر بشعلہ تو ہوں
مگر ہر ایک کو سوزِ نہاں نہیں ملتا

عجب مقام ہے اے عارفِ مقامِ خودی
یہاں پہنچ کے پھر اپنا نشاں نہیں ملتا

—•—

پاسِ آدابِ محبّت بھی ضروری ہے مگر
آرزوؤں کو بھی کچھ بے باک ہونا چاہیئے

—•—

میرے دلِ حزیں پہ کب اُن کی نظر گئی
جب حدِ التفات سے حالت گزر گئی

پوری ہو تیری حسرتِ دیدار یا نہ ہو
اے دل نگاہِ یار تو کام اپنا کر گئی

خود اپنے دل سے پوچھئے مجھ سے نہ پوچھئے
تھا کچھ اثر بھی آہ میں یا بے اثر گئی

دیکھا جو اپنے دل میں وہ دیکھا نہ پھر کہیں
یوں تو مری نگاہ سے دنیا گزر گئی

رہنے دے اب تلافیٔ مافات کا خیال
اے دوست اب تو بات ہی حد سے گزر گئی

اللہ رے شوخیٔ نگۂ التفاتِ دوست
تسکین دے کے اور بھی بے تاب کر گئی

یہ اُن کی یاد کا مگر اعجاز ہی تو ہے
جو قلبِ بے قرار میں آ کر ٹھہر گئی

ظاہر ہے میری حالتِ بے اختیار سے
جو اُن کے انتظار میں مجھ پر گزر گئی

اے عارفیؔ فسانۂ ماضی نہ چھیڑیئے
اچھی بُری گزرنی تھی جو کچھ گزر گئی

⁂

کس طرح بہلائیں دل کو شامِ ہجراں کیا کریں
آتصور میں تجھی سے کچھ ترا شکوہ کریں
حالِ دل پر خود ہے جب اُن کی نگاہِ التفات
شرم آتی ہے کہ پھر عرضِ تمنّا کیا کریں
کاوشِ غم سے تمنّاؤں کا خوں تو ہو چکا
آ اب اے دل اس میں پیدا نشۂ صہبا کریں
سُن کے اُن کا نام از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
جب یہ عالم ہو تو کیسے رازِ دل اخفا کریں
عارفی میری طبیعت سے ہیں واقف اہلِ دل
بدگمانی مجھ سے جو رکھتے ہیں وہ رکھا کریں

باقی نہ زخمِ دل میں نہ زخمِ جگر میں ہے
کچھ خونِ آرزو کی جھلک چشمِ تر میں ہے

آشوبِ روزگار سے ہے طالب سکوں
دل کا تمام عیش اسی دردِ سر میں ہے

دل چاہتا ہے نشترِ غم چھیڑتا رہے
لذت کچھ ایسی شدتِ دردِ جگر میں ہے

اے عارفی مجھے نہیں احساس شامِ ہجر
دل ہے کہ محوِ لذتِ دردِ جگر میں ہے

مجھ سے ممکن ہی نہیں ہم دم بیانِ دردِ دل
کس طرح تجھ کو سناؤں داستانِ دردِ دل

چاہتا ہوں اب کہ ساری عمر اُن کے روبرو
اک نئے عنواں سے چھیڑوں داستان دردِ دل

سننے والوں کو پریشاں دیکھ کر محجوب ہوں
چھیڑ دی میں نے کہاں یہ داستانِ دردِ دل

جس کی ساری زندگی گزری ہو ہجریار میں
وہ بھلا کب تک کہے گا داستانِ دردِ دل

عارفی اپنے ہی غم سے کس کو فرصت ہے یہاں
کون سنتا ہے کسی کی داستانِ دردِ دل

مرحلے راہ فنا کے مجھ پہ آساں ہو گئے
داغہائے دردِ ہستی شمع عرفاں ہو گئے
دل میں کیا سرمایۂ خون تمنا تھے یہی
چند قطرے جو سرِ مژگاں نمایاں ہو گئے
ہجر کی بے تابیاں اب تو مزہ دینے لگیں
جب سے ہم لذت شناس دردِ ہجراں ہو گئے
بن رہا ہے دل جو یوں پہلو میں برق مضطرب
کس کے اندازِ تبسم اس میں پنہاں ہو گئے
عارفی کیا کیجئے ان کی جفاؤں کا گلہ
ہم خود اپنی ہی وفاؤں سے پشیماں ہو گئے

آج اپنی شام تنہائی کا ہے منظر جُدا
جوشِ دردِ دل جدا ہے جوشِ چشمِ تر جُدا

جو تھا اپنے حال میں تھا مست بزمِ ناز میں
مَیں جدا، ساقی جدا، صہبا جدا، ساغر جدا

اضطرابِ شوق ہے دل میں کبھی وارفتگی
اس کا کچھ عالم جدا ہے اس کا کچھ منظر جُدا

کر دیا یہ کیا فسوں ساقی کی چشمِ مست نے
اب جو ہوتا ہی نہیں لب سے مرے ساغر جُدا

میکشانِ چشمِ مستِ ناز ساقی کے لئے
کیفِ ہر صہبا جُدا ہے ذوقِ ہر ساغر جدا

آ گیا ہے حشر کے دن اُن کا دامن ہاتھ میں
سب کا اک محشر جدا ہے اپنا اک محشر جُدا

اب ذرا کروٹ بدل کر دیکھ اے جانِ حزیں
سوزِ دل سے جل اُٹھا پہلو جدا بستر جدا

عارفیؔ اس کاہشِ غم میں بھی کتنا لطف ہے
ہو رہا ہے محوِ لذت دل جُدا، نشتر جُدا

※

میری آشفتہ دلی پر ہے یہ حیرت کیسی
اور ہوتی ہے غمِ عشق میں صورت کیسی
مجھ کو اب بے خودیٔ شوق میں احساس نہیں
وصل کہتے ہیں کسے ہوتی ہے فرقت کیسی
اشکباری ہے نہ وہ دردِ محبّت کی خلش
آج کل دیدہ و دل کی ہے یہ حالت کیسی
عاؔرفی کس کے تلون کا میں ہوں کشتۂ ناز
رنگ پر رنگ بدلتی ہے طبیعت کیسی

○

اللہ رے میرے دل میں نغموں کی فراوانی
لبریز ترنم ہے ہر جذبۂ روحانی
معمور ہے جلوؤں سے نیرنگ کدہ دل کا
ہے چشمِ حقیقت بیں آئینہ حیرانی
اک بے خودیٔ پیہم طاری ہے دل و جان پر
اور اک حقیقت ہے کیفیتِ وجدانی
سب کچھ ہے مگر کیوں ہے میں جانوں کہ دل جانے
اسرارِ محبت کا اظہار ہے نادانی

کیوں بزم دل و جاں میں ہلچل ہے خدا جانے
یاد آ گئے پھر شاید بھولے ہوئے افسانے
ہیں آرزوئیں بے خود سرشار تمنائیں
چھلکے ہوئے ساغر ہیں لبریز ہیں پیمانے
پُر کیف تموج سا ساری ہے رگ و پے میں
وہ کھول دیئے دل میں امیدوں نے مے خانے
روحانی و وجدانی ہر شوق کی محفل میں
ساقی نے لنڈھا ڈالے خمخانے کے خمخانے

○
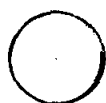
مری آنکھوں نے گل دیکھے نہ رنگ گلستاں دیکھا
مزاجِ باغباں سمجھا نہ لطف آشیاں دیکھا
تلوّن اُن کا دیکھا، انقلاب آسماں دیکھا
انہیں جب مہرباں پایا اُسے نامہرباں دیکھا
بھٹکتے ہی رہے ہم عمر بھر راہِ محبّت میں
نہ گردِ کارواں پائی نہ منزل کا نشاں دیکھا
کسی کو ناز ہے اے عارفی اپنے تغافل پر
کسی نے میرے جذبِ شوق کو اب تک کہاں دیکھا

توڑ کر عہدِ وفا تم بے وفا کیوں ہو گئے
آشنا سے مہرباں نا آشنا کیوں ہو گئے
بحرِ غم سے پار ہونا ہی نہ تھا قسمت میں جب
تم مری کشتیِ دل کے ناخدا کیوں ہو گئے
ایک مجبورِ تمنا کا تڑپنا دیکھتے
کیا کیا تم نے تغافل آشنا کیوں ہو گئے
احترامِ جامِ صہبا ہی نہ ہم سے ہو سکا
کیا بتائیں اب کہ اتنے پارسا کیوں ہو گئے

اس محبت نے کہیں کا بھی نہ رکھا عارفی
ورنہ ہم یوں بے نیازِ ماسوا کیوں ہو گئے

ناز ہے کیا کیا مری قسمت کو جب سے ہو گیا
دل رضائے یار کا، سر آستانِ یار کا

—•—

شام ہجراں سوز آہ برق ساماں دیکھ کر
ڈر رہا ہوں خرمنِ شوق فراواں دیکھ کر

جذبۂ سوز و گداز عشق پنہاں دیکھ کر
کس قدر محجوب ہوں ان کو پشیماں دیکھ کر

کچھ تصور ہی سے دل کو شاد کر لیتا ہوں میں
جلوۂ صبح وطن شام غریباں دیکھ کر

دل کی ہستی کا بکھر جائے نہ شیرازہ کہیں
کھینچ لے اے چارہ گر سینہ سے پیکاں دیکھ کر

پھر گیا آنکھوں میں منظر دل کی قرباں گاہ کا
اشک بھر آئے ہلالِ عید قرباں دیکھ کر

کیا کہوں کیا سوچتا ہوں فصل گل میں عارفی
اپنا دامن دیکھ کر اپنا گریباں دیکھ کر

اُن کے بغیر اور ہی رنگِ بہار تھا
جو پھول تھا وہ میری نگاہوں میں خار تھا

اے دوست اب جو چاہے کرے تیری بے رُخی
اب تک تو میرے دل میں سکوں تھا قرار تھا

جب آ گئے کبھی وہ تصور میں شامِ غم
آنکھوں میں اپنی جلوۂ صبحِ بہار تھا

نیرنگِ حسن و عشق کی وہ آخری بہار
تربت تھی میری اور کوئی اشک بار تھا

آنکھوں سے مَیں نے بھر لیا سب دل میں عارفیؔ
ساقی کی چشمِ مست میں جتنا خمار تھا

پہلو میں اپنے آج دلِ ناتواں نہیں
کیا جانئے غریب کہاں ہے کہاں نہیں

لے جاؤں اب کہاں دلِ راحت پسند کو
وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

صیاد کی نگاہِ کرم ہو تو اور بات
ورنہ چمن میں صرف میرا آشیاں نہیں

ہر چند اُن کی یاد ہے صبر آزمائے دل
یہ بھی نہیں کہ باعثِ تسکینِ جاں نہیں

چشمک نہ جس سے رکھتی ہو برقِ بہار آہ!
ایسا تو اس چمن میں کوئی آشیاں نہیں

جتنی توقعات تھیں سب ختم ہو چکیں
مَیں عارفی کسی سے بھی اب سرگراں نہیں

نہ سہی آپ نہیں جا۔ یئے قاتل نہ سہی
آپ کے تیرِ نظر کا کوئی گھائل نہ سہی

تجھ کو شایاں ہے تری شان کریمی یارب
مَیں گناہ گار ترے رحم کے قابل نہ سہی

اب مرے واسطے ہر موج ہے آغوشِ سکوں
بحرِ غم میں جو نہیں ہے کوئی ساحل نہ سہی

کچھ تو ہو جس سے امیدِ دلِ مایوس بندھے
مَیں نے مانا وہ مرے حال سے غافل نہ سہی

مَیں نے مانا کہ خود آئے ہو مگر آئے تو
خیر تم جذبہ دل کے مرے قائل نہ سہی

خلشِ عشق کی کچھ تو رہے حسرت دل میں!
خارِ حسرت ہی سہی، ناوکِ قاتل نہ سہی

عاؔرفی ہو تو گئے خوگرِ تسلیم و رضا
نہ ہوا گر ہمیں کچھ عشق سے حاصل نہ سہی

—•—

یہ مانا قابلِ چشمِ کرم ہستی نہیں میری
ترے در سے مگر اُٹھی نہ اُٹھے گی جبیں میری

—•—

شکر ہے حسرت ہوئی پوری دل ناشاد کی
دیکھنا تھی مجھ کو تم سے انتہا بے داد کی۔

بڑھ رہی ہے اب اسی سے لذت احساس غم
اک خلش سی دل میں رہتی ہے کسی کی یاد کی

چشمِ تر ہی ہو تو ہو کچھ ترجمانِ حالِ دل
اب دل بے تاب میں طاقت کہاں فریاد کی

ہاتھ سینے سے اُٹھانا عارفی دشوار ہے
بڑھ گئیں بے تابیاں جب سے دلِ ناشاد کی

○

جس میں ہو جوشِ طلب ایسا ہی اک دل چاہیئے
پھر نہ رہبر چاہیئے کوئی نہ منزل چاہیئے

ان کی بزم ناز میں لب کھولنا آساں نہیں
ان سے عرض مدعا کرنے کو بھی دل چاہیئے

اُس کی کیا امید ہو جو تم سے ممکن ہی نہیں
دلدہی کرنے کو بھی اے مہرباں دل چاہیئے

عارفی ہے دردِ دل ہی وجہ لطفِ زندگی
جو تڑپتا ہی رہے پہلو میں وہ دل چاہیئے

خدا دکھلائے دشمن کو نہ غم میں مُبتلا ہونا
قیامت ہے کسی دل کا گرفتارِ بلا ہونا

کہاں ممکن ہے اے دل پاسِ پیمان وفا ہونا
بہت مشکل ہے ہر حقِ محبّت کا ادا ہونا

منازلِ بے خودیٔ شوق کے سب ہو چکے پورے
بس اب باقی رہا ہے محوِ لذّاتِ فنا ہونا

ذرا صیاد گلشن اک نظر پھر دیکھ لینے دے
مجھے معلوم ہے کنجِ قفس سے اب رہا ہونا

عبث غم خوار تیرے ناخنِ تدبیر ٹوٹیں گے
ہمارے عقدۂ پیچیدہ کا مشکل ہے وا ہونا

دلِ مجبور میں باقی کہاں تاب و توانائی
ستم ہے اے تغافل کیش اب صبر آزما ہونا

نہ تھی اے ہم صفیرانِ چمن اصلا خبر اس کی
ہے قسمت میں اسیرانِ قفس کا ہم نوا ہونا

محبت خود محبت کا صلہ ہے عارفی لیکن
کوئی آسان ہے کیا بے نیازِ مدعا ہونا

*

کیا کہوں کیا کر رہی ہے کام میرے دل کے ساتھ
وہ جو اک امید سی ہے سعیٔ لاحاصل کے ساتھ
کس سہارے پر جئیں گے ہو گی کیوں کر زندگی
صبر و تسکین و تحمل تو چلے سب دل کے ساتھ
ہم ہوئے محروم واپس وائے ناکامیٔ شوق
رہ گئی اس بزم ہی میں دل کی حسرت دل کے ساتھ
اے تغافل کیش تجھ سے بھی وہ ہو سکتا نہیں
کام کر جاتا ہے جو تیرا تصور دل کے ساتھ
عارفی ہے میری خاموشی میں رنگِ اضطراب
پیچ و تابِ ضبط بھی ہیں جب سے دردِ دل کے ساتھ

آرزوؤں سے ہے نیرنگِ بہارِ زندگی
ساری دنیا کے ہیں ہنگامے فقط دل کے لئے

محبت میں گماں ہوتے ہیں کیا کیا
مرے دل کو یہ آخر ہو گیا کیا
تمہارے دل میں جو آئے کرو تم
ہماری حسرتوں کا پوچھنا کیا
رہا دل کو رضائے یار سے کام
نہ سمجھے ہم جفا کیا ہے وفا کیا
فنا ہو جائیں تیرے آستاں پر
سوا اس کے ہمارا مدعا کیا
نظر آتے نہیں خود عیب اپنے
تجھے اے چشمِ خود بیں ہو گیا کیا
نہ کیجے عارفی سے پرسشِ غم
دکھے دل کو دکھانے میں مزا کیا

ہم اسیرانِ غم کو کیا مطلب باغِ عالم میں گر بہار آئی

نہ پوچھو حال کیا ہوتا ہے پھر بے تابیٔ دل کا
کبھی جب یاد آجاتا ہے منظر اُن کی محفل کا

معاذ اللہ! کوئی انتہا ہے اس تغافل کی
وہ دل ہی میں رہے لیکن نہ سمجھے مدعا دل کا

خدا جانے کہاں کھو آئی مجھ کو بے خودی میری
دیا گم ہو کے گویا ساتھ میں نے اپنی منزل کا

کہیں اے عارفی چھپتا ہے رازِ غم چھپانے سے
مری صورت سے ظاہر ہے جو عالم ہے میرے دل کا

○
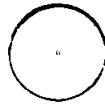
شبِ غم آہ سوزاں نے یہ دکھلایا اثر اپنا
تصور میں کوئی تھامے ہوئے آیا جگر اپنا

میں حیراں ہی رہا نظارۂ نیرنگِ فطرت میں
سمجھ ہی میں نہ آیا رازِ ہستی عمر بھر اپنا

ذرا اے بیخودی میری مجھے اتنا تو بتلا دے
کہ طے کر کے یہ منزل اب کہاں ہوگا گزر اپنا

مجھے راہِ محبت میں نہیں کچھ ہوش منزل کا
بس اک جوشِ طلب ہی عارفی ہے راہبر اپنا

کیا کہیں دردِ محبت کس مزے کا درد ہے
لذتِ سوزِ نہاں سے دل سراپا درد ہے
کیا کسی سے کہئے کیا ہے بے قراری میں مزہ
مَیں ہوں محو دردِ دل اور دل سراپا درد ہے
کون ہوتا ہے کسی کا مونسِ بے چارگی
غمگسارِ رنجِ فرقت ایک اُن کا درد ہے
خوف رسوائی سے لب پر آ نہیں سکتی فغاں
دل میں پوشیدہ ہمارے جانے کس کا درد ہے
کچھ اسی سے اب تو ہے تسکینِ جانِ بے قرار
یہ نہ پوچھو دل میں اُن کی یاد ہے یا درد ہے
میری خاموشی دلیل ضبطِ بے حد ہو تو ہو
ورنہ دل ہی جانتا ہے دل میں جتنا درد ہے
تھی کبھی اس دل کی بے تابی سے دو بھر زندگی
اب تو گویا زندگی کا اک سہارا درد ہے
عارفی اب یہ ہے عالم میری شامِ ہجر کا
مَیں سراپا ضبط ہوں اور دل سراپا درد ہے

※

اے محبت تجھ کو اپنی حشر خیزی کی قسم
رہ نہ جائے دیکھنا کوئی کمی مرے لئے

—•—

برہم نہ ہو ناموسِ محبّت کی نزاکت مَت چھیڑ کے سُن مُجھ سے غمِ دل کی حکایت

—•—

رموز کائناتِ عشق تھے کچھ ایسے پیچیدہ
نہ آئے کچھ سمجھ میں گرچہ ہم نے بارہا سمجھا

—•—

برق نظارہ نے گو خاک کیا ہے دل کو
حوصلہ دیکھئے پرشوق لقا ہے دل کو

—

عالمِ کون و مکاں کی رازداں ہے زندگی
اپنی ہی ہستی میں بحر بیکراں ہے زندگی

—•—

اے گدازِ عشق کر دے ہستیٔ دل کو فنا
کیمیائے زندگانی اس کی خاکستر میں ہے

—

آلامِ روزگار سے دل آشنا نہیں ممنونِ عشق ہوں کہ غمِ ماسوا نہیں

—

مجھے حقِ محبّت کی بس اتنی ہی تمنّا ہے
دُعائے خیر کر لینا جو میری یاد آ جائے

—

ہے کیا تمہارے دل میں بھی ایسا کوئی خیال
میرے دلِ حزیں کا تقاضا کہیں جسے

دورِ ثانی

(زمانۂ وکالت)

۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۵ء

ہردوئی ۔ جونپور

میں دیکھتا ہی رہ گیا نیرنگِ صُبح و شام
عُمرِ فسانہ ساز گزرتی چلی گئی

کوئی ہمدرد کسی کا ہے نہ پُرساں کوئی
کیا کرے لا کے زباں پر غمِ پنہاں کوئی

ہائے کیا چیز ہے رودادِ شبِ فرقت بھی
کیا کہے کس سے کہے خوابِ پریشاں کوئی

حالِ دل کہتے ہوئے خود مرا دِل دُکھتا ہے
حالِ دل سُن کے مرا ہوگا پشیماں کوئی

ابھی آئے ابھی کہتے ہو ابھی جائیں گے
آپ کی طرح نہ آئے کہیں مہماں کوئی

غم نہیں آج جو یوں بے سر و ساماں ہوں میں
ہو ہی جائے گا کبھی غیب سے ساماں کوئی

اشک بھر آتے ہیں ہر کوشش گویائی پر
حالِ دِل کہنے کو ملتا نہیں عنواں کوئی

جبہ سائی سے اگر کچھ نہیں حاصل نہ سہی
کس طرح چھوڑ دے سنگِ درِ جاناں کوئی

عاؔرفی جینا ہی پھر تو مرا مشکل ہو جائے
کہیں ہو جائے جو مشکل مری آساں کوئی

(جونپور، اگست ۱۹۳۳ء)

اک حال پہ مدّت سے دِل زار نہیں ہے
جو حال ہے وہ قابلِ اظہار نہیں ہے

درکار ہے اک شغل تقاضائے جنوں کو
اور میرے گریباں میں کوئی تار نہیں ہے

کس درجہ جنوں خیز ہے ہنگامۂ ہستی
افکار ہیں اور حاصل افکار نہیں ہے

دل میں جو ہے اک حُسنِ مجسّم کا تصوّر
اب میری شبِ تار شبِ تار نہیں ہے

اے عارفی اس دردِ محبّت کی حلاوت
کیا کہئے کوئی محرم اسرار نہیں ہے

(ہردوئی ۱۹۳۳ء)
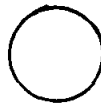
ضبطِ سوزِ غم میں رنگِ اضطرار آ ہی گیا
لب پہ آخر نالۂ بے اختیار آ ہی گیا

اس قدر پُر کیف تھی تجدیدِ پیمانِ وفا
دل کو اُس کی سادگی پر اعتبار آ ہی گیا

انتہائے یاس ہی وجہِ سکوں ثابت ہوئی
رفتہ رفتہ دِل کو اندازِ قرار آ ہی گیا

تھا یہ اعجازِ تصوّر یا فسونِ جذبِ دِل
رُوبرو جیسے وہ جانِ انتظار آ ہی گیا

غم نہیں اس کا کہ دُنیا میرے قابو میں نہیں
میرے بس میں میرا قلبِ بیقرار آ ہی گیا

کیا جنونِ جبہ سائی روکنے سے رُک سکا
عارفی در پر ترے دیوانہ وار آ ہی گیا

(ہردوئی ۱۹۳۲ء)

ہر کیفیتِ ہوش سے بیگانہ بنا دے
اے کاش محبّت مجھے دیوانہ بنا دے

گم کر دے مجھے محویت دل کی فضا میں
اے ذوقِ طلب ہوش سے بیگانہ بنا دے

درکار ہے اب اُن کی محبّت کا وہ عالم
جو خود مجھے اپنے سے بھی بیگانہ بنا دے

ساقی نگہِ مست کے اعجاز کا صدقہ
پیمانہ مرا حاصلِ میخانہ بنا دے

اتنا بھی تغافل تجھے زیبا نہیں اے دوست
مجبورِ تمنّا کو جو دیوانہ بنا دے

ہے گردشِ تقدیر کا اک ایسا بھی عالم
دُنیا کے تعلق کو جو بیگانہ بنا دے

یا دِل کو بنا خوگرِ غم ہائے تمنّا
یا دل کو تمنّا ہی سے بیگانہ بنا دے

اے عارفی جب سنگِ درِ یار پہ سر ہے
ہر سجدہ کو پھر سجدۂ شکرانہ بنا دے

کیا فائدہ دُنیا تجھے افسانہ بنائے
دُنیا ہی کو اے عارفی افسانہ بنا دے

(ہردوئی ۱۹۳۲ء)

جو ضبطِ غم سے نہ یوں خونِ مدّعا کرتے
بتا کہ پھر ترے مجبور اور کیا کرتے

خلافِ وضعِ محبّت تھی شرحِ غم لیکن
جب اختیار ہی دل پر نہ تھا تو کیا کرتے

کسی کے قدموں پہ سر رکھ کے ہوش گم رہتا
قضا ہوئے تھے جو سجدے وہ ہم ادا کرتے

بھلا دیا ہے دلِ بے خبر نے خود ہم کو
کسی کے جَورِ تغافل کا کیا گِلہ کرتے

عطا ہوئی ہے جنہیں دردِ عشق کی لذّت
نشاطِ عیشِ دو عالم وہ لے کے کیا کرتے

مآلِ عرضِ تمنّا پہ گر نظر ہوتی
کبھی نہ ہم تو دلِ زار کا کہا کرتے

بہارِ عیشِ دو عالم نثار ہو جاتی
زباں سے دل کی تباہی جو ہم ادا کرتے

کیا تھا پاسِ محبت کا عارفی دعوےٰ
نہ کرتے خونِ تمنّا تو اور کیا کرتے

(ہردوئی ۱۹۳۲ء)

※

مدّتیں گزریں کہ اب وہ سوزو سازِ دل نہیں
میرا انجامِ محبّت ذکر کے قابل نہیں

میرے پہلو میں بھی رہ کر مجھ سے یہ بیگانہ ہے
جس کو اپنا دل سمجھتا ہوں وہ اپنا دل نہیں

حُسن بے پروا کو نازِ بے نیازی ہی سہی
میرے احساسِ محبّت سے مگر غافل نہیں

مجھ کو رہنے دے یوں ہی سرگشتۂ راہِ طلب
ہمسفر جو تیری منزل ہے مری منزل نہیں

سنگِ در ہی پر ہو توفیقِ جبیں سائی عطا
میرے سجدے گر حریمِ ناز کے قابل نہیں

کوئی سُنتا یا نہ سُنتا کہہ تو لیتے حالِ دل
اپنے بس کی اب تو یہ بھی سعیٔ لاحاصل نہیں

مَیں نے کر دی کشتیٔ دِل نذرِ گردابِ فنا
بحرِ غم میں اس سے بہتر دوسرا ساحل نہیں

دِل کی ہُوکیں لب پہ آجائیں تو کوئی کیا کرے
ورنہ ظاہر ہے کہ شرحِ غم سے کچھ حاصل نہیں

ہے مرے پیشِ نظر تصویرِ انجامِ وفا
اب فریبِ آرزو وجہِ نشاطِ دل نہیں

کس قدر بے کیف ہے رعنائی بزمِ بہار
اس میں میرے نغمہ ہائے سوزِ غم شامل نہیں

عارفؔ تھا ناز تمکینِ محبت پر کبھی
وائے بیتابی کہ اب کچھ اعتبارِ دل نہیں

(ہردوئی ۱۹۳۲ء)

چھپے گا راز اب کیا چشمِ تر سے — لہو آنے لگا زخمِ جگر سے
وفورِ حسن کے جوشِ اثر سے — نظر ملتی نہیں اُن کی نظر سے
ملے دل اُن سے اب وہ دل نہیں ہے — نظر ملنے کو ملتی ہے نظر سے
مَیں دکھلاؤں تمہیں جذبِ محبّت — ملاؤ تو نظر میری نظر سے
زمانہ سازِ مطلب آشنا ہو — نظر تم کیا ملاؤ گے نظر سے
وہ اُن سے بعدِ اظہارِ محبّت — قیامت تھا نظر ملنا نظر سے
گِلا باقی رہا ان سے، نہ شکوہ — نظر جب مل گئی ان کی نظر سے
مری تقدیر کی گردش سے مطلب — جہاں کی گردشِ شام و سحر سے
تمنّا دل کی پُوری ہو تو کیوں ہو — تعلق کیا دُعاؤں کو اثر سے
مَیں وہ خُوکردۂ شامِ اَلم ہوں — کہ گھبراتا ہوں آثارِ سحر سے
سما کر رہ گئے ہیں اب وہ دل میں — چُھپا کرتے تھے جو پہلے نظر سے
مرے نالے ہیں مرے دل کی تسکین — مجھے مطلب نہیں اُن کے اثر سے
کسی کو کیا خبر کیا چیز ہیں وہ — انہیں دیکھے کوئی میری نظر سے
بہارِ عارضی کا دیکھنا کیا — بہت گزرے ہیں یہ جلوے نظر سے

اُنہیں اے عارفی دیکھا ہے مَیں نے
بہت ہٹ کر حجاباتِ نظر سے

(ہردوئی - ۱۹۳۱ء)

نہ جانے عشق کی رسوائیوں کی حد کہاں تک ہے
مری حالت سے بدظن اب تو میرا رازداں تک ہے

مزا جب ہے کہ خود مجھ سے سنو رُوداد غم میری
اثر سوزِ فغاں کا میرے اندازِ بیاں تک ہے

میں ہوں جس حال میں اے چارہ گر رہنے بھی دے مجھ کو
سہارا میرے جینے کا اسی دردِ نہاں تک ہے

دلِ مایوس کا سازِ شکستہ چھیڑنے والے
خبر بھی ہے تجھے تاثیر سوزِ غم کہاں تک ہے

یہ اُن کی دل نوازی عارضی ہم بھی سمجھتے ہیں
وفائے عہد کا دعویٰ فقط نوکِ زباں تک ہے

(ہردوئی ۱۹۳۱ء)

جل بُجھ کے رہ نہ جائے خود آہِ آتشیں سے
اندیشہ ہے تو یہ ہے مُجھ کو دِلِ حزیں سے
غفلت میں جن کو کھو کر سر اپنا دُھن رہا ہوں
جی چاہتا ہے وہ دن آجائیں پھر کہیں سے

دمِ نظّارہ آنکھوں کا مری بیکار ہو جانا	فقط حیرانیوں کا حاصل دیدار ہو جانا
لہو پانی کیا ہے مدّتوں غم کی کشاکش نے	کوئی آسان ہے کیا خوگرِ آزار ہو جانا
جب آجاتی ہے یاد اُن کی تو پہروں دل تڑپتا ہے	مجھے آتا نہیں محوِ خیالِ یار ہو جانا
وہ اُن کا پوچھنا اے عارفی حالِ دلِ مضطر
مری ہر سعیٔ ضبطِ غم کا وہ بیکار ہو جانا

(ہردوئی ۱۹۳۱ء)

○
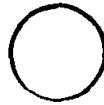
دردِ دل صبر آزما نہ رہا	زندگی کا کوئی مزا نہ رہا
کیا کسی سے گِلہ کریں تیرا	جب تجھی سے کوئی گِلہ نہ رہا
اب اُٹھادے حجابِ ناز اے دوست	دل میں کوئی ترے سوا نہ رہا
تُم نے کچھ ایسی بے رُخی برتی	غم اُٹھانے کا حوصلہ نہ رہا
دل میں اب بھی ہے عشق کی شورش	گو وہ اظہارِ برملا نہ رہا
کچھ تو آہوں سے دِل بہلتا تھا	اب تو اتنا بھی آسرا نہ رہا
عارفی اُن سے شرحِ غم کے لئے
کوئی عنوانِ التجاء نہ رہا

(ہردوئی اگست ۱۹۳۱ء)

غم پر ہے غم اور نہ اُف نکلے زباں سے
میرا سا جگر کوئی مگر لائے کہاں سے

مَیں راہِ طلب میں ہوں وہ سرگشتہ و حیراں
ٹکراتا ہوں سر اپنا ہر اِک سنگِ نشاں سے

کیوں اُن کی محبّت میں ہے یہ بے خودیٔ دل
آگاہ نہیں مَیں بھی خود اس رازِ نہاں سے

کُھل جاتے ہیں اسرارِ محبّت کے خُمِستاں
ملتی ہے نظر جب نگہِ پیرِ مغاں سے

وہ دولتِ غم دی ہے مُجھے اُن کے کرم نے
مطلب نہ رہا دہر کے اب سُود و زیاں سے

تاثیرِ نگاہِ غلط انداز کے صدقے
پُہنچا دیا مُجھ کو یہ کہاں آج کہاں سے

کیا عبرتِ افسانہ بناؤ گے مجھی کو
کیوں سُنتے ہو افسانہ مِرا مِری زباں سے

اے عارفیؔ اب تیرے دلِ زار کی حالت
ہوتی ہے عیاں خود ترے اندازِ بیاں سے

(ہردوئی اگست ۱۹۳۱ء)

رازِ دنیازِ عشق کے قابل بنا دیا
احساسِ غم نے دل کو مرے دل بنا دیا

اللہ رے جذبِ شوق کا اعجازِ رہبری
اک اک قدم کو حاصلِ منزل بنا دیا

مجھ کو تو اس مآلِ محبت پہ ناز ہے
اب دل کو اُن کے رحم کے قابل بنا دیا

اس زندگی کو میرے تخیل نے بارہا
آساں بنا دیا کبھی مشکل بنا دیا

بحرِ فنا میں دل کے سفینہ نے ڈوب کر
ہر موجِ بیقرار کو ساحل بنا دیا

ناکامیوں نے دل میں جگہ پا کے عارفی
ہر آرزو کو جذبۂ باطل بنا دیا

(ہردوئی ۱۹۳۱ء)

مَیں لاکھ توبہ کروں پھر بھی رند ہوں ساقی
مرے لئے درِ مے خانہ باز رہنے دے

نہ آئے شکوۂ غم لب پہ عارفی ہرگز
جو دل کا راز ہے دل میں وہ راز رہنے دے

—•—

محبت کی کشش اب راہبر معلوم ہوتی ہے
جدھر جاتا ہوں اُن کی رہگذر معلوم ہوتی ہے

نشاناتِ حریم ناز ہیں ہر ذرہ سے پیدا
ترے در تک ہر اک شے راہبر معلوم ہوتی ہے

رگ و پے میں ہے ساری لذّتِ دردِ جگر پھر بھی
طبیعت تشنۂ دردِ جگر معلوم ہوتی ہے

جہاں تک بھی نظر جاتی ہے جلوہ گاہِ ہستی میں
محبّت ہی محبّت جلوہ گر معلوم ہوتی ہے

نہ جانے کس ادا سے میری جانب اُس نے دیکھا تھا
ابھی تک دل میں تاثیرِ نظر معلوم ہوتی ہے

ذرا صبر اے دلِ مضطر کہ اب وہ آنے والے ہیں!
کشش آنکھوں میں تا حدِّ نظر معلوم ہوتی ہے

حقیقت زندگی کی کچھ بھی ہو اے عارفیؔ لیکن
مجھے تو گردشِ شام و سحر معلوم ہوتی ہے

(ہردوئی ۱۹۳۱ء)

آج پاسِ ضبط کا کچھ رُخ بدل کر دیکھتے
خود تڑپ کر اپنی بیتابی کا منظر دیکھتے

مَیں ہوں جس عالم میں اُس عالم کا اب کیا رنگ ہے
کاش بھولے سے کبھی تم بھی تو آکر دیکھتے

تھا بہت دلچسپ نیرنگِ سرابِ زندگی
اتنی فرصت ہی نہ پائی جو ٹھہر کر دیکھتے

دوسرا کیا رُخ ہے اپنی ہستیٔ مجبور کا
بسترِ غم پر ذرا کروٹ بدل کر دیکھتے

زیرِ مژگاں ہی رہا سرمایۂ خونِ جگر
یہ وہ آنسو ہی نہ تھا جس کو بہا کر دیکھتے

کون ہوتا ہے سرِ محشر حریفِ سوزِ دل
کھینچ کر اک آہ ہم بھی رنگِ محشر دیکھتے

عارفیؔ دل میں اگر ہوتی نہ یہ غم کی خلش
سوز و سازِ زندگی کا لطف کیونکر دیکھتے

(ہردوئی ۱۹۳۱ء)

آہ وقتِ نزع اب کیا کام مشکل رہ گیا
اور اک دم بھر کا باقی قصۂ دل رہ گیا

نوحۂ غم بے صدا ہیں نغمۂ شادی خموش
اب یہ سازِ زندگی عبرت کے قابل رہ گیا

اب نہ وہ جوشِ تمنّا ہے نہ وہ سوز و گداز
اب کہاں وہ دل فقط اک نام کا دل رہ گیا

ہر نفس اک تازیانہ تھا حیاتِ عشق میں
مَیں گرفتارِ تمنّا پھر بھی غافل رہ گیا

عارفیؔ راہِ محبت میں نشاں تھے جا بجا
وائے ناکامی کہ مَیں گم کردہ منزل رہ گیا

(ہردوئی ۱۹۲۹ء)

بس ہو چکی افکارِ دو عالم کی مدارات
اک ساغرِ غم سوز دے لے پیرِ خرابات

طاری ہے مرے دل پہ سکونِ جنوں افزا
ہیجانِ غمِ عشق کی پیدا ہیں علامات

حاصل ہو اگر معرفتِ دردِ محبّت
اُٹھ جائیں طلسمِ غمِ ہستی کے حجابات

اے بیخودیٔ ذوقِ فنا اور بڑھے جا
منزل کے نظر آتے ہیں دُھندلے سے نشانات

پہروں دلِ پُر شوق میں رہتا ہے تلاطم
ہو جاتی ہے جب اُن سے تصوّر میں مُلاقات

شاید ہے یہی حاصلِ بالیدگیٔ رُوح
اِک محویتِ سوزِ نہاں رہتی ہے دن رات

وہ اور مرے دل سے اُنھیں رابطۂ خاص
اللہ رے یہ جذبِ محبّت کے کمالات

اے عارفیؔ اُن میں بھی ہے اک درسِ محبّت
اک روز ذرا سُن تو غمِ دل کی حکایات

(ہردوئی ۱۹۲۹ء)

یہی مجبوریوں کی انتہا معلوم ہوتی ہے
کہ اب ہر سانس نفسِ مدعا معلوم ہوتی ہے

میں اپنے دل کو کس کس سے بچاؤں بزمِ ہستی میں
مجھے ہر شے یہاں کی دل ربا معلوم ہوتی ہے

اسیرانِ قفس کی ہمنوائی کیا کروں یارب
میری حالت تو ان سب سے جدا معلوم ہوتی ہے

مرے دل سے اثر پوچھے کوئی ناکامیٔ دل کا
نہ جانے اب یہ دنیا مجھ کو کیا معلوم ہوتی ہے

مکمل ہو سکا اب تک نہ اس کا کوئی افسانہ
محبت ماجرا ہی ماجرا معلوم ہوتی ہے

تمہارا کیا گلہ کچھ اپنی ہی قسمت کی خوبی ہے
ہوئے تم کیا خفا دنیا خفا معلوم ہوتی ہے

کسی مایوس کا افسردہ ہو کر مسکرا دینا
یہی مجبوریوں کی انتہا معلوم ہوتی ہے

یہ اندازِ سخن اے عارفیؔ یہ سوز و سازِ غم
طبیعت فطرتاً درد آشنا معلوم ہوتی ہے

(ہردوئی ۱۹۲۹ء)

اب مرے واسطے در بند ہیں مے خانوں کے
مجھ پر الزام ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

اک نظر آپ بھی دل کو مرے دیکھیں تو سہی
زخم کس حال میں ہیں آپ کے پیکانوں کے

کچھ مداوا ہو تو ہو وحشتِ دل کا ورنہ
سیئے جاتے ہیں کہیں چاک گریبانوں کے

ساقی اب دُردِ تہہ جام کی گردش ہی چلے
ہو چکے دَور چھلکتے ہوئے پیمانوں کے

کوششِ ضبطِ محبّت میں ہیں کتنے مجبور
کوئی دل چیر کے دیکھے ترے دیوانوں کے

عاؔرفی زندگی افسانہ در افسانہ ہے
صرف عنوان بدل جاتے ہیں افسانوں کے

(ہردوئی ۱۹۴۷ء)

خُوگرِ تسلیم کو حاصل ہے لُطفِ زندگی
رُوح کو بیدار کر دیتا ہے عرفانِ وفا

عاؔرفی اپنی جفاؤں پر پشیماں ہے کوئی
آؤ اب پھر کر ہی لیں تجدیدِ پیمانِ وفا

سازِ دلِ شکستہ کو چھیڑا نہ کیجئے
مجھ سے تو میرا حال بھی پوچھا نہ کیجئے
مانا کہ میری حسرتِ تسکیں غلط سہی
جذباتِ دل میں حشر تو برپا نہ کیجئے
ضد کی ہے اور بات تغافل ہے اور چیز
تاثیرِ جذبِ عشق کو رُسوا نہ کیجئے
یہ حرفِ آخری ہے محبت میں عارفی
گر ہو سکے تو کوئی تمنا نہ کیجئے

(ہردوئی ۱۹۲۷ء)
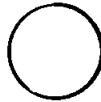
حالت یہ کہہ رہی ہے دلِ داغدار کی
اچھی نہیں فضا چمنِ روزگار کی
سُنتا تو ہوں چمن میں ہے ہنگامۂ نشاط
آئی تو ہے نوید مجھے بھی بہار کی
شاید یہی ہے اُن کے تغافل کی انتہا
تصویر بن گیا ہوں غمِ انتظار کی
کیا چیز ہے یہ جلوۂ گل میرے دل سے پوچھ
میری نگاہ میں ہے حقیقت بہار کی
سوزِ نہاں کسی پہ نہ ظاہر ہو عارفی
یہ بات تو نہیں ہے مرے اختیار کی

(ہردوئی ۱۹۲۷ء)

مَیں دل بہلاؤں کیا ہنگامہ ہائے بزمِ امکاں سے
مُجھے فرصت کہاں اپنے خیالاتِ پریشاں سے

وہی مَیں ہوں وہی تم ہو وہی مجبوریاں دل کی
پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں تجدیدِ پیماں سے

نہ بھیجے تحفتاً دو برگِ گل بھی موسمِ گل میں
شکایت ہے تو اتنی ہے مجھے اہلِ گلستاں سے

نہیں ممکن کہ رازِ عشق چھُپ جائے چھپانے سے
لہُو اشکوں میں آجاتا ہے اکثر زخمِ پنہاں سے

مَیں اُس بے درد کی اس سادگی پہ عاؔرفی قرباں
توقع ضبط کی رکھتا ہے جو مجھ سوختہ جاں سے

(رہردوئی ۱۹۲۶ء)

شدتِ غم میں نہ جانے آج کتنا جوش ہے
قطرہ قطرہ خون کا دل میں تلاطم کوش ہے

ہم نشیں رازِ شکستِ دل کا افسانہ نہ سُن
رہنے دے خاموش گریہ سازاب خاموش ہے

زندگی اور اس پہ نازِ اعتبارِ زندگی
ہوش ہے یہ ہوش والے یا فریبِ ہوش ہے

عارفی کیوں سانحاتِ غم سے ہو افسردگی
جب حیاتِ مختصر رختِ فنا بر دوش ہے

(جھانسی ۱۹۲۵ء)

یہ کیا کہئے کہ یہ عمرِ دو روزہ کس طرح گزری
مری ہستی کا جو منظر ہے اک خوابِ پریشاں ہے

تری پُرسش کے صدقے اب تو یہ محسوس ہوتا ہے
بظاہر درد ہے دل میں مگر در پردہ درماں ہے

کیا اوروں کو بے خود مے سے مجھ کو چشمِ میگوں سے
یہ مجھ پر عارفی پیرِ مغاں کا خاص احساں ہے

—•—

ہم ساری عمر محوِ غمِ رفتگاں رہے
اس طرح جیسے گردِ پسِ کارواں رہے

خلوت کدہ میں دل کے تو وہی مہماں رہے
اے بیخودیٔ شوق بتا ہم کہاں رہے

وہ آئے اور دیکھ کے غافل چلے گئے
ہم اپنی بیخودی میں نہ جانے کہاں رہے

کچھ لطفِ زندگی ہے نہ احساسِ زندگی
ہم کیا جئے کہ مائلِ خوابِ گراں رہے

غم کی خلش نے رُوح کو بیدار کر دیا
جی چاہتا ہے اب یہ خلش جاوداں رہے

تسکین دے رہی ہے کسی کی نگاہِ لُطف
اے کاش یوں ہی شدّتِ دردِ نہاں رہے

جینا ہے جب فضائے قفس ہی میں عمر بھر
گلشن میں پھر بہار رہے یا خزاں رہے

دل ضبطِ غم سے ہجر میں خوں ہو کے بہہ گیا
ہم تھے کہ محوِ لذّتِ دردِ نہاں رہے

بس رحم اے نگاہِ تغافل نواز رحم
ممکن ہے اب نہ طاقتِ ضبطِ فغاں رہے

اک طرزِ التفاتِ کرم ہے جفائے دوست
جی چاہتا ہے روز نیا امتحاں رہے

اے سوزِ عشق تیری بدولت تمام عمر!
جس حال میں بھی ہم رہے آتش بجاں رہے

نازک سی چیز ہستیٔ دل اک لہو کی بوند
پھر یہ ستم کہ اس میں غمِ دو جہاں رہے

تم کو نگاہِ بازپسیں ڈھونڈتی رہی
اس وقت بھی تم آہ نہ جانے کہاں رہے

میرا مقامِ نازِ محبت نہ پا سکے
ہر چند جستجو میں مرے رازداں رہے

صیاد و باغباں کی یہ کوشش ہے عارفی
گلشن میں مَیں رہوں نہ مرا آشیاں رہے

مسجد ہو بُت کدہ ہو کہ مے خانہ عارفی
رُوحِ رواں ہی بن کے رہے ہم جہاں رہے

(ہردوئی ۱۹۲۵ء)

ذرّہ ذرّہ دل کا سوزِ عشق سے معمور ہے
اب مرے پیشِ نظر ہر دم فضائے طُور ہے

اب نگاہیں بھی اگر ملتی ہیں تو بیگانہ وار
تم پہ کیا موقوف دُنیا کا یہی دستور ہے

تھا تصوّر میں عجب عالم جمالِ یار کا
دل میں اب تک کیف ہے آنکھوں میں اب تک نور ہے

پھونک دے دل کو بلا سے آتشِ سوزِ نہاں
نالہ ناممکن ہے مجھ سے اور سب منظور ہے

عاؔرفی جب مل گیا ہے رہبرِ کامل مجھے
اس کی پھر کیا فکر منزل پاس ہے یا دُور ہے

عبث موہوم اُمیدوں سے دل رہتا ہے اُلجھن میں
اثر کیسا کسی دلگیر کے ناکام شیون میں

ہجوم یاس و فرطِ شوق سے فرصت نہیں دل کو
قفس میں بھی وہی بے تابیاں ہیں جو تھیں گلشن میں

محبت عاؔرفی بے لوث ہی پر لطف ہوتی ہے
نہ جانے پڑ گیا کیوں دل تمناؤں کی اُلجھن میں

کیسا جنوں فزا یہ طلسم بہار ہے
ہر پھول ہے شگفتہ مگر دل فگار ہے
اک وجہ بے خودی ہے مجھے کیفِ انتظار
وہ آئیں گے یہاں یہ کسے اعتبار ہے
بھولے سے بھی جو آئے تو کیوں آئے میری یاد
اب یہ بھی اُن کی خاطر نازک پہ بار ہے
اللہ رے فریبِ محبّت کی وسعتیں
مایوس ہو کے بھی جو دِل امیدوار ہے
سو بار کھا چُکا ہے فریبِ نگاہ دوست
پھر بھی یہ دل فریفتۂ اعتبار ہے
آتا نہیں سمجھ میں کہ کیا کیجیے عارفی
دل میں کچھ ایسی کیفیتِ اضطرار ہے

دستگیری کی نہ ہوتی خود اگر تقدیر نے　　کھو دیا تھا مجھ کو دنیا سے مری تدبیر نے
مَیں نہ جانے کن اُمیدوں پر تھا محوِ سوز و ساز　　اُف بُرا ہو کہ دیا اس آہ بے تاثیر نے
پہروں تنہائی میں اس سے گفتگو کرتا ہوں میں
ایسا دیوانہ بنایا ہے تری تصویر نے

زباں پر جو حرفِ وفا لایئے گا
پھر آنکھیں ملانے میں شرمایئے گا
کہاں تک کسی پر ستم ڈھایئے گا
نہ پچھتایئے گا تو پچھتایئے گا
کچھ اس طرح دل سے بھلایا ہے مجھ کو
بہت عمر بھر آپ یاد آیئے گا
مجھے بے خبر ہو کے یہ دیکھنا ہے
تغافل سے کب تک نہ باز آیئے گا
ہے کیا چیز تاثیرِ جذبِ محبّت
کسی دن یہ خود ہی سمجھ جایئے گا
پریشانیاں تو ہیں یہ عمر بھر کی
کہاں تک بھلا ان سے گھبرایئے گا
بہت سوز ہے عارفی سازِ غم میں
اگر چھیڑیئے گا تڑپ جایئے گا

کوئی رُخ ہو زندگی کا ہیں مگر اک رازہم
سازاندرسوز ہیں یا سوز اندرسازہم
اپنی ہی دھن میں ہیں اب تو محوِ سوزوسازہم
پا گئے ہیں بےخودی میں زندگی کا رازہم
زندگی کے جتنے ہنگامے ہیں سب بےکیف ہیں
کیا کریں آخر علاجِ خاطرِ ناسازہم
عارفی اتنی خبر ہے اپنی ہستی کی ہمیں
سُن رہے ہوں جیسے کوئی دُور کی آوازہم

لٹا رہا ہوں متاعِ دل اپنے ہاتھوں سے
جسے نہ ہوش ہو اپنا وہ ہوشیار ہوں میں
مجھے تو اپنے گناہوں پہ وجد آتا ہے
کہ خلق کہتی ہے تیرا گناہ گار ہوں میں

ظاہر یہ کس کے حسن کی تنویر ہو گئی
دُنیا تمام عالمِ تصویر ہو گئی

اب ہم نہیں ہیں آہ سزا وارِ جور بھی
کیا جانے ہم سے کون سی تقصیر ہو گئی

اتنا بھی نامرادِ محبت نہ ہو کوئی
نکلی جو آہ دل سے وہ دل گیر ہو گئی

آتا ہے لطف اپنی ہی باتوں میں اب مجھے
کچھ ایسی دل نشیں تری تقریر ہو گئی

تھی زندگی عجیب سا اِک خواب عارفی
جو یوں رہینِ کثرتِ تعبیر ہو گئی

یہ مرا وجدانِ فطری یہ محبّت کی لگن
اس کے ہر احساس میں ہے نشۂ خمرِ کہن
اس نے بھر دی میرے دل میں مستیٔ سوز و گداز
عمر بھر رکھا مجھے مدہوش صہبائے سخن

کچھ اس صورت سے محوِ لذّتِ بے تابیٔ دل ہوں
بظاہر دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ غافل ہوں
شکستہ کشتیٔ دل اور یہ طوفانِ غم پیہم
مگر مَیں ہوں کہ پھر آسودۂ امیدِ ساحل ہوں
مرا اک اک قدم راہِ طلب میں درسِ عبرت ہے
جسے منزل نہ راس آئی مَیں وہ ناکام منزل ہوں
نہ چھیڑ اے عاؔرفی ناموسِ ضبطِ غم کا افسانہ
مَیں بے تابِ تمنّا باعثِ رسوائیٔ دل ہوں

اُن سے نسبت ہے تو پھر کچھ غم نہیں
جس طرح چاہیں مجُھے رسوا کریں

اُف خیالاتِ پریشاں کا ہجوم
کچھ نہیں آتا سمجھ میں کیا کریں

ہم کو کیا حق التفاتِ خاص کا
کس لئے ہم آپ کا شکوہ کریں

عاؔرفی تھا جس سے لطفِ زندگی
کس طرح پھر اب وہ دل پیدا کریں

اب تو چمن میں ہوش ہے گل کا نہ خار کا
دامن کشاں ہے حُسن کسی نو بہار کا

گل سینہ چاک ہے دلِ لالہ ہے داغ داغ
اچھا فریب ہے یہ طلسم بہار کا

افسردہ دل چمن میں بھی افسردہ ہی رہے
جادو چلا نہ کچھ بھی نسیمِ بہار کا

ہے وہ بلا جنونِ تمنّا کہ کچھ نہ پوچھ
دل کے لئے نہیں کوئی عنوان قرار کا

یوں مجھ کو چھیڑ کر مری روداد غم نہ پوچھ
کیا اعتبار دیدۂ خونابہ بار کا

آئی خزاں کی یاد تو دل سرد ہو گیا
کچھ دیر بھی تو لطف نہ آیا بہار کا

مجھ کو تھا ناز جذبِ محبّت پہ عارفی
مَیں ہوں فریب خوردہ اسی اعتبار کا

جب سے ہُوا ہے عارفی احساسِ زندگی
عالم ہی اب کچھ اور ہے لیل و نہار کا

کیا کروں نظارہ ہائے روح پرور دیکھ کر
بُجھ گیا دل سانحاتِ غم کے منظر دیکھ کر

دیکھئے کیا رنگ لائے احتیاطِ ضبطِ غم
ڈر رہا ہوں مَیں سکونِ قلبِ مضطر دیکھ کر

میری از خود رفتگی نے سب کو بے خود کر دیا
رند ورنہ جوش میں تھے دورِ ساغر دیکھ کر

کیا انہیں اندازۂ ضبطِ جنونِ شوق ہے
مُسکرا دیتے ہیں کیوں وہ مُجھ کو اکثر دیکھ کر

کیا کوئی آسان ہے اس سوزشِ غم کا علاج
چارہ گر دیتا ہے کیا رگ رگ میں نشتر دیکھ کر

عارفی یہ زندگی وہ ہے کہ جس میں عمر بھر
داغ دیتا ہے فلک بہتر سے بہتر دیکھ کر

کیا دل لگائیے چمنِ روزگار سے
جو پھول ہے یہاں کا وہ بدتر ہے خار سے
اک درد ہو تو فکر مداوا کرے کوئی
کیا کیا میں دل کا حال کہوں غمگسار سے
جب آشیاں ہی اپنا چمن میں نہیں رہا
پھر کیا ہمیں وہاں کی خزاں و بہار سے
دل ڈھونڈتا ہے اب تو کوئی کنج عافیت
گھبرا گیا ہوں گردشِ لیل و نہار سے
پہلا سا ارتباط محبّت وہ اب کہاں
ملتے ہیں وہ تو ملتے ہیں بیگانہ وار سے

(کراچی ۱۹۶۱ء)

یہ سچ ہے نو گرفتارِ قفس فریاد کیا جانے
گزرتی ہے مگر جو دل پہ وہ صیاد کیا جانے

ہوئے ہیں کیسے کیسے خانماں برباد کیا جانے
وہ نو مشق جفا اندازۂ بے داد کیا جانے

کوئی ڈوبا ہوا تھا کن خیالاتِ پریشاں میں
سنانے والا پیغامِ مبارک باد کیا جانے

میری خاموشئ مجبور درد انگیز ہے شاید
یہ دل تھامے ہوئے پھرتا ہے کیوں صیاد کیا جانے

میں اپنے دل کو فارغ کر چکا تھا ہر تمنا سے
وہ اس شدت سے اب کیوں آ رہے ہیں یاد کیا جانے

مری تخیل کی رنگینیاں بے کیف رہتی ہیں
مجھے بھولے ہوئے ہے کیوں تمہاری یاد کیا جانے

نگاہِ لطف سے بھی عاقلہ فی تسکین نہیں ہوتی
ہے اتنا مضطرب کیوں یہ دل ناشاد کیا جانے

یہ کیوں ہر آرزو صبر آزما معلوم ہوتی ہے
پس پردہ وہ چشم فتنہ زا معلوم ہوتی ہے
میں اپنے دل کو کس کس سے بچاؤں بزمِ ہستی میں
مجھے ہر شئے یہاں کی دلربا معلوم ہوتی ہے
تمہارا کیا گلہ، یہ خوبیٔ تقدیر ہے میری
ہوئے تم کیا خفا، دنیا خفا معلوم ہوتی ہے

—•—

کبھی بھولے سے بھی اب وہ کرم فرما نہیں ہوتے
ترستا ہے تجلّی کو مرا کاشانہ برسوں سے
کہیں سینہ نہ شق ہو جائے اے ضبطِ وفورِ غم
نہیں آیا ہے لب پہ نعرۂ مستانہ برسوں سے

—•—

فرطِ غم میں بھی نہ ہم رو پائے جی بھر کے کبھی
دل جو اُمڈا بھی تو آنسو زیرِ مژگاں ہی رہے
جانے کیا کیا انقلاب آنکھوں نے دیکھے عمر بھر
واقعاتِ زندگی خوابِ پریشاں ہی رہے

رفتہ رفتہ ہو گیا دردِ محبّت لاعلاج
اور چارہ ساز محوِ فکرِ درماں ہی رہے

مدت ہوئی ہے دل کو شکیبا کئے ہوئے
ترکِ جنون عرضِ تمنّا کئے ہوئے

—•—

یارب ہے تیرے فضل و کرم ہی کی نوازش
کر لیتا ہوں جو فخر و مباحات کی باتیں

—•—

چاہتا ہوں کہ رہے حرمتِ توبہ قائم
سوچتا ہوں کہیں گردش میں اگر جام آیا

—•—

عہدِ رنگیں مدتوں تک یاد تھا
لیکن اب وہ بھی فسانہ ہو گیا

—•—

میرے دردِ دل کا اس میں بھی مداوا ہے بہت
وہ یونہی جھوٹی تسلی مجھ کو دے جایا کریں

—•—

عارفی ہے کائناتِ دل فقط وہم و گماں
کچھ نہیں ہے اور سب کچھ ہے اسی دل کے لئے

—•—

اچھا نہیں ہوتا اثرِ سوزِ محبت
وہ محوِ تغافل اسے جانے کہ نہ جانے

—•—

کون رکھے گا دلِ مایوس کے زخموں کی شرم
پردہ در تو ہی اگر اے دیدۂ تر ہو گیا

دورِ ثالث

سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۶۳ء

جونپور — کراچی

عارفیؔ بس یہ حقیقت ہے میرے اشعار کی
نالہ ہائے دل جب آئے لب پہ موزوں ہو گئے

یہ مرے اشعار میرے دل کے موزوں حسّیات
یہ مری طبع رسا کی اک بیاضِ ملہمات
یادگار ہستئ فانی ہیں ، لیکن تا بکے!
یعنی جب نقشِ فنا ہے خود جہانِ بے ثبات

عارفیؔ

لاکہیں سے ڈھونڈھ کر اے عمرِ رفتہ دل وہی
مے وہی، مینا وہی، ساقی وہی، محفل وہی

ہیں مقاماتِ محبّت اک طلسمِ پیچ و خم
جس جگہ پہنچا نظر آئی مجھے منزل وہی

کوئی بھی عالم ہو اُن سے بُعد ہو یا قُرب ہو
بے خودیٔ دل وہی، وارفتگیٔ دل وہی

اے تصوّر اے مرے آئینہ دارِ بزمِ دوست
پا رہا ہوں تجھ میں بھی کیفِ نشاطِ دل وہی

ہے دلِ دیوانہ اپنی دُھن میں سرگرمِ طلب
تلخیٔ حاصل وہی ہے سعیٔ لا حاصل وہی

کارفرما ہے ابھی تک جذبۂ پیرِ مُغاں
مستیٔ رنداں وہی ہے گرمیٔ محفل وہی

جس جگہ معراج ہوتی ہے جنونِ شوق کی
ہے مقاماتِ محبّت میں مری منزل وہی

اب یہ عالم ہے ذرا بھی جب کبھی خلوت ہوئی
پھر وہی جانِ تصوّر پھر حدیثِ دل وہی

جس کے نغموں سے لرز اُٹھتی ہے بزمِ سوزِ غم
چاہتا ہوں چھیڑنا سازِ شکستِ دل وہی

مَیں نے چھیڑی تھی کبھی جو بیخودی میں پیشِ دوست
ہے زبانِ اہلِ دل پر داستانِ دل وہی

ہے بقدر ہمتِ دل جادۂ ذوقِ طلب
بیٹھ جاؤں تھک کے جس جا، ہے مری منزل وہی

یاد اُن کی عشوہ ہائے ناز میں ڈوبی ہوئی
برقِ جان و دل وہی تسکینِ جان و دل وہی

غاؔرفی اب تک وہی میرا مزاجِ عشق ہے
پاسِ ضبطِ غم وہی سوز و گدازِ دل وہی

(کراچی ۶۳ ۱۹ء)

مَیں چھپاؤں لاکھ لیکن میری آشُفتہ دِلی
رازِ بیدادِ محبّت برملا کہنے کو ہے

جوشِ فصلِ گُل میں بھی دل کی کلی کھِلتی نہیں
یہ بہارِ جانفزا بس جانفزا کہنے کو ہے

کیا کوئی حقِ محبت ہو بھی سکتا ہے ادا
اپنا سارا دعوئ پاسِ وفا کہنے کو ہے

پردہ دارِ شورشِ دل خامشی ہوتی ہے کیا
اہتمامِ ضبط سے غم میں کمی ہوتی ہے کیا
بے کلی ہوتی ہے کیا آشفتگی ہوتی ہے کیا
کیا بتاؤں ہم نفس دل کی لگی ہوتی ہے کیا
پا رہا ہوں دردِ دل میں لذتِ ایمائے دوست
ایسی حالت بھی محبت میں کبھی ہوتی ہے کیا
لذّتِ بے کیفیٔ دل لذّتِ حاصل سہی
تلخیٔ شورِ محبت میں کمی ہوتی ہے کیا
اِک ادائے چارہ فرما اِک نگاہِ دل نواز
اور اک آزردہ خاطر کی خوشی ہوتی ہے کیا
چشمِ مستِ نازِ ساقی کے اشاروں سے پُوچھ
تشنگی ہوتی ہے کیسی، مے کشی ہوتی ہے کیا
اُن کی بزمِ ناز ہی میں اس کو سمجھا تھا کبھی
زندگی کہتے ہیں کس کو زندگی ہوتی ہے کیا
ڈوب سا جاتا ہے دل رہ رہ کے اُن کی یاد میں
کیا کسی سے کہئے وجہِ بیخودی ہوتی ہے کیا
مَیں نے ساری عمر کی ہے خدمتِ پیرِ مغاں
مُجھ سے پوچھو میکدہ کی زندگی ہوتی ہے کیا
دید کے قابل ہے یہ منظر کہ اُن کے روبرو
اہلِ دل اہلِ نظر کی بے بسی ہوتی ہے کیا
ذکر اُن کا چھیڑ کر دیکھے کوئی اسے عاؔرفی
بیخودی کیا چیز ہے وارفتگی ہوتی ہے کیا

(کراچی ۱۹۶۳ء)

آشفتہ دلی ہے نہ وہ شوریدہ سری ہے
پھر بھی مگر اک آگ سی سینے میں دبی ہے

یاد اُن کی ہے اک بادۂ سرجوشِ مُحبّت
اور اب مری رگ رگ میں یہی چیز بھری ہے

کیا کیجئے آشوب تمنّائے وفا کو
یہ آگ کسی سے نہ بجھی تھی نہ بجھی ہے

وہ صُبح تمنّا ہے نہ وہ شام تمنّا
لیکن دِل وارفتہ کا انداز وہی ہے

جو کچھ بھی ہو انجامِ گدازِ غمِ پنہاں
فی الحال تو کچھ باعثِ تسکین یہی ہے

دل کو تپشِ شوق کی یہ لذّتِ پیہم
مل تو گئی لیکن بڑی مشکل سے ملی ہے

اس میں ہے مگر کوثر و تسنیم کی خنکی
آنکھوں میں جو یہ اشکِ محبّت کی نمی ہے

اے عارفی اب اس دلِ پُر شوق کا عالم
اک عالمِ صد بادہ و صد تشنہ لبی ہے

(کراچی ۶۲ ۱۹ء)

محبّت نے کچھ ایسا کیفِ جذبات نہاں بدلا
مذاقِ زندگی بدلا مزاجِ جسم و جاں بدلا

مری وارفتگیٔ دل سے آخر بدگماں ہو کر
نگاہِ ہمنشیں بدلی خیالِ رازداں بدلا

نہ جانے اہلِ ظاہر کیا سمجھتے اُن کی نسبت کو
ہمیں نے مصلحت دیکھی کہ ربطِ داستاں بدلا

قدم رکھا ہی تھا میں نے ابھی کوئے تمنّا میں
کہ اتنی دیر میں سو بار رنگِ آسماں بدلا

نہ ممکن ہو سکی تکمیل شرحِ مدّعا مجھ سے
ہزار عنوان بدلے لاکھ اندازِ بیاں بدلا

بہت لیل و نہارِ زندگی بدلے محبّت نے
نہ میرا سوزِ غم بدلا نہ اندازِ فغاں بدلا

بہت بدلا مذاقِ دل خیالِ یار نے لیکن
جو شایانِ مذاقِ یار تھا ایسا کہاں بدلا

مجھے تھا ناز اپنے جذبۂ ایثار پر لیکن
مذاقِ غیرتِ دل کیا کہوں کیوں ناگہاں بدلا

یہی ہے عارفیؔ دُنیا کی بس رسمِ شناسائی
اِدھر آنکھیں ہوئیں بند اور اُدھر نام و نشاں بدلا

(کراچی ۱۹۶۱ء)

اب دل میں نہیں کوئی تمنّا کئی دن سے ۔ پاتا ہوں خود اپنے کو بھی تنہا کئی دن سے

اک عالمِ وارفتگی و بے خبری ہے ۔ کچھ ہوش میں دل ہی نہیں اپنا کئی دن سے

اب تابِ تکلم ہے نہ یارائے تخاطب ۔ دل ہی نہیں اندر سے اُبھرتا کئی دن سے

جیسے کوئی احساس ہی باقی نہیں دل میں ۔ ہر چیز ہے اک خواب سی گویا کئی دن سے

اب دل میں تڑپتی نہیں مجروح امیدیں ۔ رِستا نہیں اب زخمِ تمنّا کئی دن سے

ہو مائلِ پُرسشِ نگہِ لُطف کسی کی ۔ اب یہ بھی نہیں دل کو گوارا کئی دن سے

ہیں پیشِ نظر عمرِ گذشتہ کے مناظر ۔ مَیں دیکھ رہا ہوں یہ تماشا کئی دن سے

اس زندگیٔ شُعبدہ انگیز کا عالم ۔ کیا کہئے نظر آتا ہے کیا کیا کئی دن سے

دنیا سے تعلق کے حجابات اٹھا دوں ۔ ہے دیدۂ عبرت کا تقاضا کئی دن سے

بے کیفیٔ جذبات کی کیا وجہ بتاؤں ۔ حالِ دلِ مضطر نہیں اچھا کئی دن سے

اے عارفی آخر یہ ہُوا کیا مرے دل کو

سُونی سی نظر آتی ہے دُنیا کئی دن سے

رازِ از خود رفتگیٔ عشق اِفشا کر دیا
اے دلِ مدہوش کیفِ حُسن یہ کیا کر دیا
ڈُوب کر کیفِ محبت میں کسی کی یاد نے
دِل کے ہر احساس کو جانِ تمنّا کر دیا
چشمِ مستِ نازِ ساقی کی ادائے خاص نے
میکشوں کو بے نیازِ جام و صہبا کر دیا
یادِ عہدِ آرزو کی صبر آشوبی نہ پُوچھ
جب بھی آئی اک تلاطم دل میں پیدا کر دیا
ہو رہے ہیں دل میں جذباتِ محبت موجزن
اضطرابِ شوق نے پھر کچھ تقاضا کر دیا
اِک ذرا جی بھر کے اُن سے کہہ تو لیتے حالِ دل
اے ہجومِ شوق یہ کیا حشر برپا کر دیا
دل کی ساری آرزوئیں ہوگئیں آتش بجاں
تُو نے اے لُطفِ نگاہِ دوست یہ کیا کر دیا
تھا مرا ضبطِ جنونِ شوق خود ہی مضطرب
کچھ نگاہِ فِتنہ زا نے بھی اشارہ کر دیا
لذّتِ سوزِ فغاں کی محویت نے عارفی
خود مرے ناموسِ ضبطِ غم کو رسوا کر دیا

(کراچی ۱۹۶۱ء)

یہ حُسنِ یقیں رُوحِ رواں میرے لئے ہے
خود اُن کا حریمِ رگِ جاں میرے لئے ہے

شاید یہی تسلیمِ محبّت کا صِلہ ہے
ہر دولتِ حُسنِ دو جہاں میرے لئے ہے

اُن کی نگہِ ناز تو ہے جانِ تمنّا
رَگ رَگ میں یہ کیوں برقِ تپاں میرے لئے ہے

معلوم نہیں حاصل و بے حاصلئ عشق
اِک محویتِ جذبِ نہاں میرے لئے ہے

جو کچھ بھی ہو جس کے لئے فیضانِ محبت
پیہم تپشِ سوزِ نہاں میرے لئے ہے

کیا فائدہ اُس جذبۂ ایثارِ وفاء سے
جو خاطرِ نازک پہ گراں میرے لئے ہے

کیوں دل کو غمِ عشق سے سیری نہیں ہوتی
یہ بات خود اِک رازِ نہاں میرے لئے ہے

دُنیا میں سکوں اور کہیں مل نہیں سکتا
بس ایک درِ پیرِ مغاں میرے لئے ہے

انجامِ شب و روز کا کچھ ہوش نہیں ہے
اور زندگی اک خوابِ گراں میرے لئے ہے

محسوس یہ ہوتا ہے تری حُسن ادا سے
جو کچھ ہے ترا سحر بیاں میرے لئے ہے

مَیں عارفی آوارہ صحرائے فنا ہوں!
اِک عالمِ بے نام و نشاں میرے لئے ہے

(کراچی ۱۹۶۱ء)

محوِ مقامِ ناز ہوں کون و مکاں سے دُور
گُم ہوں رہِ نیاز میں نام و نشاں سے دُور
اے بے نیازِ پاسِ وفا اک نگاہِ رحم
ہے کوئی سر بسجدہ ترے آستاں سے دُور
میرا مذاقِ عشق ہے خاموش سوزِ غم
مَیں فطرتاً ہوں شورشِ آہ و فغاں سے دُور
اب ہوں کسی کے جذبِ کرم ہی کا منتظر
میری طلب تو ہے مری تاب و تواں سے دُور
کیا یاد آؤں گا تجھے اب اے خیالِ دوست
مَیں تو نکل گیا ترے وہم و گماں سے دُور
مَیں وہ امینِ پاسِ محبّت ہوں عارفی
میری وفا رہی ہے ہر اک امتحاں سے دُور

(کراچی جون ۱۹۶۱ء)

نہ کریں آپ مرے دل کا مداوا نہ کریں
پُرسشِ غم سے مگر حشر تو برپا نہ کریں

یونہی ہو جائے گا خود خونِ تمنّا اک دن
ہم اگر خود نہ کریں ترکِ تمنّا، نہ کریں

وجہِ آشوبِ دل و جاں ہے محبّت میں یہی
ہو سکے ہم سے تو ہم کوئی تمنّا نہ کریں

حالِ دل کہنے کی جرأت کوئی آساں تو نہیں
خود وہی اپنے کرم سے جو اشارہ نہ کریں

اب تو کچھ پاسِ محبّت کا تقاضا ہے یہی
اُن سے ہم پاسِ محبّت کا تقاضا نہ کریں

خیر توبہ سہی شغلِ مئے و مینا سے مگر
یہ تو ممکن نہیں ذکرِ مئے و مینا نہ کریں

پاسِ پیمان و وفا شرطِ مروّت ہے ضرور
میری خاطر مگر آپ اس کا ارادہ نہ کریں

خلشِ شوق کو سیری نہیں ہوتی جب تک
تجھ سے کچھ تیری شکایت ترا شکوہ نہ کریں

عارفی جانِ محبّت ہے تمنّا ان کی
کس سہارے پہ جئیں پھر جو تمنّا نہ کریں

(کراچی جولائی ۱۹۶۱ء)

ہے میرے لئے کیفِ دل و ذوقِ نظر اور
میرے دل و جاں میں ہے محبت کا اثر اور

اُس نرگسِ مخمور کی دُزدیدہ نظر میں
ہے میرے لئے جرعۂ صہبائے نظر اور

اے کاش کہ تھم جائے ذرا گردشِ دوراں
کچھ روز ٹھہر جائیں یہی شام و سحر اور

اللہ یہ اس دردِ محبت کے کرشمے
اب ہیں یہ مرے قلب و جگر، قلب و جگر اور

اُس انجمنِ ناز سے اس طرح اُٹھا ہوں
کچھ نشۂ دل اور ہے کچھ کیفِ نظر اور

ہے سب سے جدا میرا شبستانِ تمنا
یاں ظلمتِ شام اور ہے یاں نورِ سحر اور

پڑتی ہے جو ساقی کی نگاہِ غلط انداز
بڑھ جاتی ہے کچھ تشنگیٔ قلب و جگر اور

اک توشۂ اُمید کرم لے کے چلا ہوں
کچھ اس کے سوا پاس نہیں زادِ سفر اور

میں عارفیؔ بیگانۂ ہم ذوقِ سخن ہوں
فطرت نے عطا کی ہے مجھے فکر و نظر اور

(کراچی، ستمبر ۱۹۶۱ء)

اک طلسم جادہ و منزل ہے اک اک گام پر
غیر ممکن سی ہے تیری جستجو تیرے بغیر

دیر تک دل میں رہا اک عالمِ وارفتگی
آگیا جب یادِ عہدِ آرزو تیرے بغیر

ہزاروں جلوہ گاہِ ناز ہیں ہر سُو جدھر جائے
ترا سرگشتۂ ذوقِ طلب آخر کدھر جائے
یہی جی چاہتا ہے اب تو دُنیائے تعلق میں
نہ ہو تیرے سوا کوئی جہاں تک بھی نظر جائے
مَیں یوں تو چُن رہا ہوں خارِ غم لیکن یہ ڈرتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو شیرازۂ دل ہی بکھر جائے
بس اے کیفِ محبّت ایک جام ایسا بھی دے مُجھ کو
اُتر جائے خمارِ آرزو، یہ دردِ سر جائے

بڑی غفلت میں گزری عارفیؔ عمرِ عزیز اب تک
کہیں ایسا نہ ہو یہ وقت بھی یُونہی گزر جائے

(کراچی ۱۹۶۰ء)

عمر بھر دیکھا کئے نیرنگئ شام و سحر
یہ نہ سمجھے غایت شام و سحر ہوتی ہے کیا
تشنہ کامِ شوق ہی کے دل سے پوچھا چاہیئے
اک دزدیدہ محبت کی نظر ہوتی ہے کیا

یہاں تک دل میں حشر انگیز یادِ یار ہو جائے
رگ و پے میں محبت جذبۂ بیدار ہو جائے

حیاتِ جاوداں اُس کی نشاطِ کامراں اُس کا
جو دل لذت کشِ ذوقِ نگاہِ یار ہو جائے

تعجب ہے وہی اک پاس جذباتِ محبت کا
کہیں آسان ہو جائے کہیں دشوار ہو جائے

دلِ پُرشوق جس کو جلوہ گاہِ ناز بننا تھا
غضب ہے یوں رہینِ شورشِ افکار ہو جائے

مرے ذوقِ محبت میں یہ توہینِ محبت ہے
کہ دل کی آرزو وجہ نشاطِ کار ہو جائے

اب اتنا تو نہ کر آزردہ اے آشوبِ غم دل کو
تمنا ہی سکونِ قلب کی بے کار ہو جائے

ابھی اے عارفی جو حالِ دل کہنا ہے وہ کہہ لے
بہت ممکن ہے پھر ناقابلِ اظہار ہو جائے

(کراچی - ۱۹۶۰ء)

کسی کی یاد میں دل اس طرح سرشار ہو جائے
کبھی مدہوش ہو جائے کبھی ہشیار ہو جائے

عجب کیا گر امید و یاس کی پیہم کشاکش ہے
خود اپنی آرزوؤں ہی سے دل بیزار ہو جائے

کسی سے کیا توقع پرسشِ غمہائے پنہاں کی
کرم اُس کا جو مجھ کو دیکھ کر غمخوار ہو جائے

جہاں بھی بیٹھ کے یاد کرلیں اہلِ دل اُن کی
وہ بزمِ ناز بن جائے، وہ بزمِ یار ہو جائے

کُھلا کرتا ہے اس پر میکدہ میں رازِ مے نوشی
نگاہِ مستِ ساقی سے جو دل سرشار ہو جائے

بہارِ حُسن کو یوں جذب کرلوں دیدہ و دل میں
محبت میں مرا ذوقِ نظر معیار ہو جائے

مری آنکھوں میں چشمِ مستِ ساقی کا ہے وہ عالم
نظر بھر کر جسے بھی دیکھ لوں میخوار ہو جائے

محبت میں یہ امیدِ وفا اچھی نہیں اے دل
کہیں ایسا نہ ہو بڑھ کر خود اک آزار ہو جائے

زباں پر آ رہے ہیں بر ملا اسرارِ مے خانہ
جسے مدہوش ہونا ہو ذرا ہوشیار ہو جائے

اُسی کو عارفی ہے کچھ سکونِ جاوداں حاصل
جو دل آسودۂ خلدِ خیالِ یار ہو جائے

(کراچی ــــــ ۱۹۶۰ء)

اب یہ ہے مری بے خودئ شوق کا عالم
ہوں ہوش میں اس طرح کہ کچھ ہوش نہیں ہے

اب دل میں کہاں جرأت اظہارِ تمنّا
اس جام میں اب بادۂ سرجوش نہیں ہے

مرے عہدِ آرزو میں وہ بہار کا زمانہ
مرا ایک خوابِ شیریں، مرا اک حسیں فسانہ
ہے فضول گردشوں میں مرے واسطے زمانہ
نہ مری کوئی حقیقت نہ مرا کوئی فسانہ
مجھے فطرتاً ملا ہے یہی ذوق زندگی کا
نہ کسی سے دشمنی ہے نہ کسی سے دوستانہ
مرے دل سے کوئی پوچھے تری گردشِ نظر کو
یہی گردشِ مقدر، یہی گردشِ زمانہ
مرا دعوئ محبت بعد آرزو و ارماں
ترے حسن کی پرستش بہ مذاق کافرانہ
جو شکستِ عشق مضطر کا یقین نہ تھا تو کیا تھا
مرے دل کو اس نے دیکھا بغرور فاتحانہ
اسی سعئ ضبطِ غم میں دلِ زار ہو گیا خوں
کہیں آنہ جائے لب پر کوئی آہِ والہانہ
ذرا آزما کے دیکھوں اثرِ گدازِ غم کو
مرے دل میں آرہا ہے یہ خیالِ مجرمانہ

ہے اُنہی کا ذکر ہر دم بہ ہزار کیف و مستی
تجھے عارفی مبارک یہ جنونِ عارفانہ

(کراچی جنوری ۱۹۶۰ء)

بس اب دل ہٹانے کو جی چاہتا ہے
بھلا دیں زمانے کو جی چاہتا ہے

خود اپنے ہی اندازِ وارفتگی پر
کبھی مسکرانے کو جی چاہتا ہے

بہت یاد آتا ہے عہدِ تمنّا
مگر بھول جانے کو جی چاہتا ہے

تجھے بھول کر اے غمِ زندگانی
ذرا مسکرانے کو جی چاہتا ہے

تمہاری محبت کا خوابِ پریشاں
تمہی کو سنانے کو جی چاہتا ہے

تجھے اب تو اے ماورائے تصوّر
تصوّر میں لانے کو جی چاہتا ہے

سُنی ہیں جو اُن کی لبِ جانفزا سے
وہ باتیں سنانے کو جی چاہتا ہے

ذرا یہ بتا اے جنونِ تمنّا!
مجھے کیوں ستانے کو جی چاہتا ہے

اثر ہے بھی کچھ عارفی جذبِ دل میں
یہ اب آزمانے کو جی چاہتا ہے

(کراچی - ۱۹۶۲ء)

کچھ تقاضائے جنونِ جستجو ہی دل میں ہے
کیا کشش ورنہ طلسمِ جادہ و منزل میں ہے

جب سے آغوشِ تصور میں ہے وہ حسنِ تمام
ماورائے ہر دو عالم ایک عالم دل میں ہے

مجھ سے ممکن ہی نہیں ترکِ تمنائے وفا
کیف صد حاصل مجھے اس سعیٔ لاحاصل میں ہے

اس محبت کا مذاقِ صبر آشوبی نہ پوچھ
جو قیامت تک نہ ہو پوری وہ حسرت دل میں ہے

صرف دو آنسو بہت ہیں شرحِ غم کے واسطے
کیا خبر بھی منتظر دریا کا دریا دل میں ہے

ہر طرح پُر امن ہے آغوشِ گردابِ فنا
اور ہر اندیشۂ جان دامنِ ساحل میں ہے

ناشناسِ چشم و لب، بیگانۂ شرح و بیاں
مضطرب سا اک تقاضائے محبت دل میں ہے

اب ذرا تو ہی خبر لے اے نگاہِ رحمِ دوست
ڈھونڈنے والا ترا کیا جانے کس منزل میں ہے

کہہ چکا جی بھر کے اُن سے جو بھی کہنا تھا مجھے
پھر بھی اب تک حسرتِ شرحِ تمنا دل میں ہے

اُن کا حسنِ فتنہ زا ہے یا مرا عشقِ حزیں
کون یہ آتش نوا محوِ ترنم دل میں ہے

کچھ خبر بھی ہے تجھے اے نازِ اعجازِ نظر
اِک قتیلِ کم نگاہی بھی تری محفل میں ہے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اک اک گوشۂ امید میں
وہ نشاطِ زندگی جس کی تمنا دل میں ہے

بن کے آہِ آتشیں لب پر نہ آ جائے کہیں
وہ گدازِ غم جو اک مدت سے پنہاں دل میں ہے

عارفی اب ہے یہی ایمائے چشمِ نازِ دوست
پھونک دے سوزِ نہاں سے جو بھی حسرت دل میں ہے

(دسمبر - ۱۹۵۹ء)

میری جمعیتِ خاطر کے جو ساماں ہوں گے
میرے ہی دل کے سب اجزائے پریشاں ہوں گے

تابکے یورشِ افکار مسلسل آخر
تُو ہی ہوگی نہ ہم، اے گردشِ دوراں ہوں گے

جب کبھی اہلِ وفا یاد کریں گے مجھ کو
جانے کیا کیا مری رُوداد کے عنواں ہوں گے

اک ذرا ہونے تو دو ذوقِ محبّت کامل
پھر یہ دل ہوگا نہ یہ حسرت وارماں ہوں گے

اللہ اللہ یہ مرا ذوقِ نظر حُسنِ نظر
کیا خبر تھی انہی پردوں میں وہ پنہاں ہوں گے

حاصلِ شکوۂ بیدادِ محبّت کیا ہے
آج تک وہ نہ ہوئے ہیں نہ پشیماں ہوں گے

اور بھی لذّتِ آزار نہ بڑھ جائے کہیں
چارہ گر مفت میں درماندۂ درماں ہوں گے

تھے تو ہم بھی تری محفل میں مگر کیا کہیے
کسی عالم میں کہیں سر بہ گریباں ہوں گے

عارفی لب پہ اگر آ بھی گئی آہ تو کیا
کتنے ہوں گے جو حریفِ غمِ پنہاں ہوں گے

(کراچی ۱۹۵۹ء)

بے محابا جب تصوّر میں کوئی آجائے ہے
پھر نہ تڑپا جائے ہے دل سے نہ سنبھلا جائے ہے

جب کبھی آتا بھی ہے ترکِ تمنّا کا خیال
شوق دل میں اور اک شعلہ سا بھڑکا جائے ہے

ہُوک سی اُٹھتی ہے جب دل میں کسی کی یاد سے
چند لمحوں کو محبّت کا مزہ آجائے ہے

کیا کروں ہنگامۂ عالم میں تدبیرِ سکوں
اب تو دل اس کے تصوّر سے بھی گھبرا جائے ہے

جس قدر تھکتے ہُوئے محسوس ہوتے ہیں قدم
اعتبارِ قربِ منزل اور بڑھتا جائے ہے

کیا کہیں اُن کے تصوّر سے تغافل کا گلہ
جانے کیا چپکے سے آکر دل کو سمجھا جائے ہے

جس نے سمجھا ہو جنونِ شوق کو رازِ حیات
عارفی کیا اور بھی کچھ اس سے سمجھا جائے ہے

(کراچی ستمبر ۱۹۵۹ء)

دلِ بے تاب ہی میں دم نہیں ہے
مجھے اب نازِ ضبطِ غم نہیں ہے

نہ جانے کتنے عالم دل پہ گزرے
مگر اب کوئی بھی عالم نہیں ہے

عبث ہے زحمتِ عرضِ تمنّا
محبّت جذبۂ مبہم نہیں ہے

زمانہ بھر مخالف ہو تو غم کیا
مزاجِ یار تو برہم نہیں ہے

بہت کم ہے اُمیدِ باریابی
مگر دل کی تگ و دو کم نہیں ہے

ذرا صبر اے جنونِ بدگمانی
نگاہِ لُطف اگر پیہم نہیں ہے

یہاں ہر غم ہے تمہیدِ مسرّت
یہ دُنیا محفلِ ماتم نہیں ہے

بہت ہے عارفی بے کیفیِ دل
مگر کیفِ محبّت کم نہیں ہے

(کراچی مئی ۱۹۵۹ء)

بارِ خاطر ہے اگر یہ بھی تو یہ بھی نہ سہی
نہ سہی پاسِ وفا کے کوئی معنی نہ سہی
دل کی رگ رگ میں ہے اب تو اثرِ سوزِ نہاں
یوں مری آہوں میں پہلی سی وہ گرمی نہ سہی
زیرِ لب آہ بھی ہے ذوقِ محبّت میں گناہ
شرحِ غم پاسِ محبّت کے منافی نہ سہی
التفاتِ نگہِ لطف ہی اب کیا کم ہے
رنجِ بیدادِ تغافل کی تلافی نہ سہی
وجہِ آشوبِ دل و جاں ہی سہی ہو تو مگر
نگہِ ناز بعنوانِ تسلّی نہ سہی
مجھ کو رہنے دو یونہی محوِ تماشائے جمال
نہیں ہوتی جو مرے شوق کو سیری نہ سہی
مَیں تصوّر ہی سے ساقی کے ہوں مست و بیخود
جام و صہبا نہ سہی محفلِ ساقی نہ سہی
عارفی دردِ محبّت میں عجب لذّت ہے
دل نہیں ہے جو ابھی خوگرِ تلخی نہ سہی

(کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء)

جانے کیا انجام جانِ مبتلا ہونے کو ہے
اب تو ہر احساسِ غم صبر آزما ہونے کو ہے

کیا خبر تھی اُف محبّت کی وہ آہِ اوّلین
میری ساری زندگی کا ماجرا ہونے کو ہے

منتظر ہے اس طرح بے تابیٔ ذوقِ نظر
جیسے کوئی دفعتہً جلوہ نما ہونے کو ہے

مِل ہی جائے گا مجھے اب تو حریمِ نازِ دوست
اعتبارِ جذبۂ دل رہنما ہونے کو ہے

اے خیالِ یار اے غارت گرِ صبر و قرار
اب تو دل میں تُو ہی جانِ مدّعا ہونے کو ہے

دیکھ کر یہ رنگِ عالم دم بخود ہوں عارفی
جانے یہ کیا ہو رہا ہے جانے کیا ہونے کو ہے

(کراچی مارچ ۱۹۵۸ء)

کیا بتاؤں ہم نشیں کیا چیز ہے دردِ نہاں
لذتِ دردِ نہاں لیکن بلا کی چیز ہے
آنسوؤں میں صَرف کر دوں کس طرح خونِ جگر
یہ امانت تو غمِ صبر آزما کی چیز ہے

اب کیا کہیں کیا بھول گئے اور ہے کیا یاد
کچھ بھی نہ رہا اُن کی تمنّا کے سوا یاد

یاد اُن کی بھلا دیتی ہے افکارِ دوعالم
بس اب یہی ایک شغل ہے اندوہ ربا یاد

جس منزلِ دشوار پہ اب دل کا گزر ہے
اک ایک قدم پر وہاں آتا ہے خدا یاد

نالے ہیں نہ آہیں نہ خلش ہے نہ تپش ہے
کچھ بھی نہ رہا محویتِ دل کے سوا یاد

میرے دلِ وارفتۂ حیرت کو ہے اب تک
اس نازشِ صد ناز کی ایک ایک ادا یاد

مجھ کو ہے ترے نازِ تغافل سے شکایت
کیا میرے لئے ہے یہی اندازِ جفا یاد

ہو جاتی ہے رہ رہ کے جو یہ بیخودیٔ دل
آجاتی ہے اک جلوہ گہِ ہوش ربا یاد

کس طرح کہیں کب کہیں اور کیا کہیں اُن سے
اس کشمکشِ شوق کا اب تک ہے مزا یاد

پاتا ہوں عجب کیفیتِ جذبِ محبّت
اے محویتِ دل یہ مجھے کس نے کیا یاد

کیا جذبِ محبّت میں اثر ہی نہیں کوئی
آتے ہی نہیں آپ کو اربابِ وفا یاد

ہو جاتی ہیں بے کیف سی مخمور بہاریں
آجاتی ہے جب میکدۂ دل کی فضا یاد

تھا ناز تجھے عارفی اربابِ وفا پر
بھولے سے بھی تجھ کو تو کسی نے نہ کیا یاد

ہے ترکِ تمنّا بھی عجب سحرِ محبّت
آنے لگے وہ اور بھی کچھ حد سے سوا یاد

اے عارفی کیا چیز تھی ناکامیٔ دل بھی
آجاتا ہے اکثر خلشِ غم کا مزا یاد

(کراچی۔ جنوری ۱۹۵۸ء)

کیا نشّۂ صہبا سے مجھے کام ہے ساقی
بس اب تو مرے لب پر ترا نام ہے ساقی

شاید ہے یہی حاصلِ مے خانۂ کونین
ساغر ہیں مرے جو مئے بے نام ہے ساقی

بس اک نگہِ لطف ذرا جلد ادھر بھی
مشکل سے یہاں فرصتِ یک جام ہے ساقی

مے دے کہ نہ دے در پہ پڑا رہنے دے اپنے
یہ رِند ترا بندۂ بے دام ہے ساقی

تری نگہِ مست کی ایک ایک ادائیں
میرے لئے کیفیّتِ صد جام ہے ساقی

میں رِند بلا نوش ہوں رسوائے خرابات
اور مفت میں میرے لئے بدنام ہے ساقی

ہو جائے عطا عارفِؔ تشنہ جگر کو
مَس کردۂ لب تیرا جو یہ جام ہے ساقی

(کراچی - ۱۹۵۷ء)

مآلِ کشمکشِ ضبطِ غم معاذ اللہ
یہ زیرِ مژہ اک آنسو یہ زیرِ لب اک آہ
عجیب چیز ہے وارفتگیٔ ذوقِ طلب
جنہیں میں ڈھونڈھ رہا تھا وہی تھے خود ہمراہ
یہ اُن کے حُسنِ عطا کے لطیف عنوانات
کسی کے لب پہ تبسّم کسی کے لب پر آہ
یہ فیضِ دردِ محبّت ہے عاؔرفی مجھ پر
مَیں اپنے دل کی حقیقت سے ہو گیا آگاہ

(کراچی۔۱۹۵۷ء)

مجھے مطلوب ہے تیری رضا ہر حال میں یارب
مجھے پرواہ نہیں دنیا اگر بیگانہ ہو جائے
بس اب اپنا بنالے میرے دل کو اسطرح یارب
نگاہوں میں مری سارا جہاں بیگانہ ہو جائے

بس اب تو اس طرح جینا ہے اس دُنیائے عبرت میں
خود اپنی زندگی اپنے لئے افسانہ ہو جائے

دِل جو یوں طالبِ پیمانِ وفا ہے اے دوست
یہ بھی کچھ ذوقِ محبّت کی خطا ہے اے دوست
کِس طرح جلوہ گہِ ناز میں اُٹھیں گے قدم
یاں تو ایک ایک نفس ہوش رُبا ہے اے دوست
کاش تجھ کو بھی ہو کچھ پاسِ وفا کا احساس
بس یہی میری وفاؤں کا صِلہ ہے اے دوست
میں ترے جلووں میں گم ہوں تیرے جلوے مجھ میں
کچھ عجب تیرے تصوّر کی فضا ہے اے دوست
غمِ ہستی سے مفر کی کوئی صُورت ہی نہیں
اک تری یاد ہی اندوہ رُبا ہے اے دوست
جو ترے نازِ تغافل کی فضا میں گُم ہے
کیا تجھے بھی کہیں اُس دل کا پتا ہے اے دوست
شرحِ غم کے لئے آنکھوں میں جو اشک آجائیں
اتنی جرأت بھی تو تیری ہی عطا ہے اے دوست
یہ مری عرضِ تمنّا یہ مرا جذبۂ شوق!
تجھ سے کچھ تو مجھے اُمیدِ وفا ہے اے دوست
عارفؔ کشتۂ بے دادِ محبّت ہی سہی
سب گوارا ہے جو یہ تیری رضا ہے اے دوست

(کراچی جولائی ۱۹۶۱ء)

کچھ یہی سوز و گدازِ عشق کا حاصل سہی
میرے نالے باعثِ تسکینِ اہلِ دل سہی

کیفِ شوریدہ سری یا لذّتِ بے حاصلی
ہے محبت کا یہی حاصل یہی حاصل سہی

غمزۂ حُسنِ تغافل ہی تو ہے جانِ وفا
اے جنونِ شوق اچھا مجھ سے وہ غافل سہی

کم نہیں یہ بھی کہ ہوں مَیں بھی حریمِ ناز میں
التفاتِ حُسن سے بے خود سہی غافل سہی

کب کسی نے آج تک پایا مقامِ نازِ دوست
عمر بھر ذوقِ طلب آوارۂ منزل سہی

کوئی تو آخر مرے گم گشتہ دل کی دے خبر
عشق کے رہرو سہی راہیں سہی منزل سہی

کوئی تو معیار ہو آخر مآلِ عشق کا
میرا ضبطِ غم سہی میرا گدازِ دل سہی

عارفی جب ہے یہی ایمائے چشمِ نازِ دوست
عمر بھر وارفتگیٔ پیچ و تابِ دل سہی

(کراچی فروری ۱۹۵۷ء)

یہ بھی اے دل اثرِ دردِ نہاں ہے شاید
دیکھ رگ رگ مری اب تو رگِ جاں ہے شاید
اُن کی وہ یاد جو سرمایۂ تسکیں تھی کبھی
اب وہی دل میں مرے برقِ تپاں ہے شاید
اِک نگاہِ غلط انداز فقط ایک نگاہ
تجھ کو اے دوست مگر یہ بھی گراں ہے شاید
جانے کیا بات ہے کیوں اہلِ نظر حیراں ہیں
میری حالت سے کوئی راز عیاں ہے شاید
مَیں جو یوں کیفیتِ دل سے ہوں مست و بیخود
کارفرما نگہِ پیرِ مغاں ہے شاید
یہ مری شورشِ پنہاں یہ مرا سوز و گداز
چارہ گر تجھ کو کوئی اور گماں ہے شاید

عارفی دل میں یہ احساسِ تمنّا کیا ہے
اپنی ہستی کا کوئی وہم و گماں ہے شاید

(کراچی اکتوبر ۱۹۵۶ء)

احساس زندگی کا کبھی ہے کبھی نہیں
مدّت ہوئی کہ حالتِ دل ایک سی نہیں
سرگشتگی شوق کا اندازہ کیا ہے اُسے
صہبائے چشمِ ناز کبھی جس نے پی نہیں
رعنائی بہار سے انکار ہے کِسے
مَیں کیا کروں کہ میرے لئے دلکشی نہیں
جب تک سما نہ جائے دل وجاں میں اُنکی یاد
کہنے کو زندگی ہے مگر زندگی نہیں
کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
اُن کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں
سرگشتۂ خمارِ محبت ہوں عارفی
محتاجِ جام و بادہ مری مے کشی نہیں

(کراچی ۱۹۵۶ء)

اُن سے امید کوئی کیا رکھے　　جب وفا ہی نہیں زمانے میں
میری رُسوائیوں کا کیا کہنا　　تم ہی تم ہو مرے فسانے میں

اس قدر آشفتگیٔ جسم و جاں ہے آج کل
ہر نفس دل کے لئے بارِ گراں ہے آج کل

ہے بہت صبر آزما اُن کی نگاہِ فتنہ زا
اور اُس کی زد میں قلبِ ناتواں ہے آج کل

دیکھتا ہوں اُن کی برگشتہ نگاہوں کا اثر
ہر نگاہِ مہرباں نامہرباں ہے آج کل

مَیں سمجھتا ہوں جو اُن کی بے رُخی کا راز ہے
دعویٔ پاسِ وفا کا امتحاں ہے آج کل

حسرتیں صبر آزما، ناکامیاں ہمّت شکن
کچھ عجب مشکل میں جانِ ناتواں ہے آج کل

کیا کہیں اپنے دلِ بے تاب کی درماندگی
آہ کرنا بھی طبیعت پر گراں ہے آج کل

ڈھونڈ تو لیتے کہیں کھویا ہُوا دل کا سکوں
اے غمِ تازہ مگر فرصت کہاں ہے آج کل

اس توقع پر کہ پھر آئے گا وہ جانِ بہار
میرا دل آسودۂ جورِ خزاں ہے آج کل

زندگی اپنی کبھی تھی مثلِ موجِ بوئے گُل
ایک اک لمحہ مگر بارِ گراں ہے آج کل

عادؔفی کیا حال ہے تیرے دلِ پُر سوز کا
کیوں یہ لب پر بیخودی میں "الاماں" ہے آج کل

(کراچی - ۱۹۶۶ء)

کس قدر وجد آفریں دردِ نہاں ہے آج کل
کیف میں ڈوبا ہُوا سوزِ فغاں ہے آج کل

ڈھونڈتا ہے دل وہی کیفِ فضائے بزمِ دوست
اے مرے رنگیں تصوّر تو کہاں ہے آج کل

بڑھتی جاتی ہے دلِ پُر شوق کی وارفتگی
نام اُن کا اس طرح وردِ زباں ہے آج کل

اُن کی یاد اُن کا تصور اُن کا ذکر اُن کا خیال
کچھ یہی سرمایۂ تسکینِ جاں ہے آج کل

جانے کس عالم میں اُن کی یاد نے پہنچا دیا
کیا بتائیں ہم کہاں ہیں دل کہاں ہے آج کل

ہیں ہم آغوشِ تصور جلوہ ہائے حُسن دوست
ایک اک لمحہ حیاتِ جاوداں ہے آج کل

پا رہا ہوں بیخودی میں لُطف معراجِ حیات
مَیں ہوں اور سنگِ درِ پیرِ مغاں ہے آج کل

اے دلِ وارفتہ ایسی بیخودی اچھی نہیں
بر ملا لب پر مرے رازِ نہاں ہے آج کل

اب وہ شورش تو نہیں ہے کاوشِ غم میں مگر
کچھ عجب کیفیت جذبِ نہاں ہے آج کل

ڈوبتا جاتا ہے دل کیفِ نشاطِ شوق میں
کیا کہیں پیشِ نظر کیسا سماں ہے آج کل

یا مری گرویدگی دل ہی حد سے بڑھ گئی
یا انہی کی ہر ادا کچھ دلستاں ہے آج کل

اُن کا نازِ بے نیازی کا تصور کچھ نہ پُوچھ
حشر ساماں تھا کبھی اب جانِ جاں ہے آج کل

جلوہ در جلوہ ہے نیرنگِ طلسمِ آرزو
اک فضائے گلستاں در گلستاں ہے آج کل

چھا گئی خلدِ تصور میں بہارِ بے خزاں
اب تو اک اک شاخِ گل پر آشیاں ہے آج کل

دل کی رگ رگ میں محبت نے سما کر کیا کیا
اک لہو کی بوند بحرِ بیکراں ہے آج کل

خود بخود کھل جائیگا اک دن یہ رازِ حُسن و عشق
میری ہستی اک حجابِ درمیاں ہے آج کل

عاؔرفی کچھ اعتبارِ رنج و راحت ہی نہیں
زندگی کا ہر تغیّر ناگہاں ہے آج کل

(کراچی - ۱۹۵۶ء)

محفلِ سوز و گدازِ غم کو گرمائے گا کون
اہلِ دل کو اپنے دردِ دل سے تڑپائے گا کون

موجزن ہے کس کے دل میں آتشِ سیّالِ غم
مستیٔ خونِ جگر آنکھوں سے برسائے گا کون

کس پہ طاری ہے جنونِ عشق کی وارفتگی
یوں زباں پہ والہانہ رازِ دل لائے گا کون

عاؔدِنی میرا ہی دل ہے محرمِ نازونیاز
بعد میرے رازِ حُسن و عشق سمجھائے گا کون

مٹ گئی اے یاس گر زخمِ تمنّا کی خلش
لذّتِ دردِ نہاں سے دل کو تڑپائے گا کون

کس طرح سمجھوں عبث ہے یہ فریبِ انتظار
شامِ غم کی بے کسی میں دل کو بہلائے گا کون

یاد آجاتی ہے رہ رہ کر وہ چشمِ مستِ ناز
گر یہی عالم رہا تو ہوش میں آئے گا کون

کب تک آخر یورشِ افکار کی باتیں کریں
آؤ اب کچھ دیر بزمِ یار کی باتیں کریں
اپنے دل کو اپنی خلوت کا بنا کر ہم نشیں
عشوہ ہائے حُسن و عشقِ یار کی باتیں کریں
عشق کی رنگیں فضاؤں کے ترانے چھیڑ دیں
حُسن کے پرکیف جلوہ زار کی باتیں کریں
پیچ و تابِ غم کو دل سے محو کر دیں سر بسر
ہو کے بیخود چشمِ مستِ یار کی باتیں کریں
پہلے جان و دل میں بھر لیں مستیٔ صہبائے شوق
پھر کسی کی لذّتِ گفتار کی باتیں کریں
تلملا کر دل کی ہر خوابیدہ حسرت جاگ اُٹھے
یوں کسی کی شوخیٔ رفتار کی باتیں کریں
اضطرابِ شوق میں رنگِ جنوں آنے لگا
کس طرح اب حُسنِ عشوہ کار کی باتیں کریں

عارؔفی وارفتگیٔ دل ہی جو چاہے کرے
ورنہ ہم اور اپنی جانِ زار کی باتیں کریں

(کراچی ۱۹۵۶ء)

عیشِ بزمِ دوست عیشِ جاوداں سمجھا تھا میں
یہ بھی اک خوابِ سحر ہے یہ کہاں سمجھا تھا میں

مجھکو اپنی بیخودی کا وہ بھی عالم یاد ہے
جب کسی کو اپنے دل میں میہماں سمجھا تھا میں

لذّتِ دردِ نہاں بھی بارِ خاطر تھی مجھے
کچھ اسے بھی اک حجابِ درمیاں سمجھا تھا میں

یادِ عہدِ آرزو بھی رفتہ رفتہ مٹ گئی
اور اسی کو حاصلِ عمرِ رواں سمجھا تھا میں

کیا غلط تھا اے دلِ ناعاقبت اندیش اگر
اُن سے اُمیدِ وفا کو رائیگاں سمجھا تھا میں

منزلِ ذوقِ طلب میں جادۂ ہستی سے دُور
تم وہیں آخر ملے مجھ کو جہاں سمجھا تھا میں

رفتہ رفتہ ہو گئی برہم زنِ صبر و قرار
یاد اُن کی باعثِ تسکینِ جاں سمجھا تھا میں

اللہ اللہ تھی اُنہی کے پائے نازک پر جبیں
بیخودی میں سجدہ گہ کو آستاں سمجھا تھا میں

دل کی باتیں اُن سے کہدیں اس طرح دیوانہ وار
جیسے اُن کو اپنے دل کا رازداں سمجھا تھا میں

عارفی کیا مجھ پر ہوتا رنج و راحت کا اثر
زندگی کو دُھوپ چھاؤں کا سماں سمجھا تھا میں

(کراچی فروری ۱۹۵۶ء)

مرے دل پہ اُن کی نظر اللہ اللہ
یہ دل اب دلِ معتبر اللہ اللہ
یہ ہے کون پیشِ نظر اللہ اللہ
دل و جاں ہیں زیر و زبر اللہ اللہ

یہ حُسنِ تجلّی کا فیضِ تصوّر
سرِ شام نُورِ سحر اللہ اللہ
خود اپنے ہی دل کی فضاؤں میں گم ہوں
عجب بے خودی ہے مگر اللہ اللہ

بڑی کش مکش میں ہیں پُر سوز آہیں
فریبِ اُمیدِ اثر اللہ اللہ
مَیں ہوں عارفی کس مقامِ طلب میں
مجھے کچھ نہیں ہے خبر اللہ اللہ

(کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۶ء)

ہر طرف حُسنِ ضیا بار ہے اللہ اللہ | پھر بھی دل تشنۂ دیدار ہے اللہ اللہ
دل جو یوں بیخود و سرشار ہے اللہ اللہ | التفاتِ نگہِ یار ہے اللہ اللہ
اے محبت ترے فیضانِ اثر کے صدقے | یہ جو اِک لذّتِ آزار ہے اللہ اللہ
یاد رکھنا تو اُنہیں سہل نہیں ہے لیکن | بھُول جانا بھی تو دشوار ہے اللہ اللہ
اے دل اُس محوِ تغافل کے تصوّر کے سوا | کیا کوئی اور بھی غم خوار ہے اللہ اللہ
یہ کرشمہ ہے محبّت میں تمنّاؤں کا | مجھ سے دل بر سرِ پیکار ہے اللہ اللہ
یہ ہوس دل میں کہ خم خانے بھی خالی کر دوں | اور لب پر مرے انکار ہے اللہ اللہ
جیسے کشتی کوئی منجدھار میں آجاتی ہے | زندگی کی یہی رفتار ہے اللہ اللہ
آپ یوں جس کی عیادت کے لئے آجائیں | پھر وہ بیمار بھی بیمار ہے اللہ اللہ
یہ کھُلا رازِ محبّت ہیں فنا ہونے پر | کون اب کس کا طلب گار ہے اللہ اللہ
نشّۂ بے خودیٔ دل کا یہ عالم تو بہ | ہوش میں آنا بھی اب بار ہے اللہ اللہ
اپنے ہی غم کی کشاکش سے کسے فرصت ہے | کون کس کا یہاں غمخوار ہے اللہ اللہ

عارفی ہوگئی یہ بھی بڑی پُرکیف غزل
اس کے ہر شعر میں تکرار ہے اللہ اللہ

(کراچی نومبر ۱۹۵۵ء)

خبر کیا تھی بنا لے گی محبت ایسا دیوانہ
مجھے بننا پڑے گا خود محبت ہی کا افسانہ

بظاہر خشک لب ہوں تشنگیٔ ذوقِ صہبا سے
مگر دل میں بھری ہے مستیٔ خمہائے میخانہ

بہت عنوان سوچے اور بہت خاکے بنا ڈالے
مرتب ہو سکا لیکن نہ اب تک دل کا افسانہ

کسی بے درد کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلک آئیں
نگاہِ یاس کہہ سکتی ہے اک ایسا بھی افسانہ

نہ چھوڑا شائبہ تک دل میں احساسِ دو عالم کا
معاذ اللہ محبت کا یہ اندازِ حریفانہ

بہت چاہا نہ ظاہر ہو کسی پر رازِ ضبطِ غم
دو آنسو کہہ گئے لیکن شکستِ دل کا افسانہ

جسے پینا ہو آنکھوں سے وہ میری بزم میں آئے
مرا دل چشمِ مستِ نازِ ساقی کا ہے میخانہ

کسی کا ذکر ہے اور اہلِ محفل مست و بیخود ہیں
بظاہر یاں نہ ساقی ہے نہ صہبا ہے نہ پیمانہ

یہاں تک بڑھ گئی وارفتگیٔ شوقِ نظارہ
حجاباتِ نظر سے پھوٹ نکلا حُسنِ جانانہ

اسے اے عارفی سمجھا ہے کوئی اور نہ سمجھے گا
جو فرطِ بیخودی میں کہہ گیا میں رازِ میخانہ

میں اس دل سے بہت مجبور ہوں اے عارفی ورنہ
کہاں یہ صبحِ پیری اور کہاں یہ شامِ میخانہ

(کراچی جنوری ۱۹۵۵ء)

مبتلائے کیفِ سوز و ساز ہے
دل ابھی تک ناشناسِ راز ہے

ہے چمن میں اور کیا اس کے سوا
رنگ ہے یا بُو ہے یا آواز ہے

ناز اُٹھائے ہیں کسی کے عمر بھر
اپنے دل پر خود مجھے بھی ناز ہے

ہوش میں آ اے دلِ توبہ پرست
میکدہ کا در ابھی تو باز ہے

جو ابھی مُرجھا کے ہو جائے گا خاک
کیا اسی گُل پر چمن کو ناز ہے

لاکھ اسے افشا کروں سمجھے گا کون
ہمنشیں یہ مے کدہ کا راز ہے

میرا ہر اک شعر گویا عارفی
اضطرابِ قلب کی آواز ہے

(کراچی فروری ۱۹۵۵ء)

کیا ہو گئی ہے گردشِ دوراں مرے لئے
صبحِ وطن ہے شامِ غریباں مرے لئے
اب جاذبِ نظر نہیں رعنائیِ چمن
بے کیف سی ہے صبحِ بہاراں مرے لئے
کچھ بھی نہیں ہے اب تو تری یاد کے سوا
سرمایۂ سکونِ دل و جاں مرے لئے
اس طرح جان و دل میں سمائے ہوئے ہیں وہ
اک ایک رگ ہے اب تو رگِ جاں مرے لئے
بے مہریٔ زمانہ سے دل سرد ہو گیا
آئی نہ راس صحبتِ یاراں مرے لئے
بزمِ جہاں میں ہے تو ہو ہنگامۂ نشاط
کیا کم ہے میرا کنجِ شبستاں مرے لئے
آخر بہار آتے ہی یا رب یہ کیا ہُوا
بدلا ہُوا ہے رنگِ گلستاں مرے لئے
اے عارفی اسی میں تو ہے لطفِ زندگی
رہنے دے اضطرابِ رگِ جاں مرے لئے
محسوس کر رہا ہوں کہ اے قلبِ بے قرار
تھم سی گئی ہے گردشِ دوراں مرے لئے
مَیں جانے کس مقامِ محبت میں گم ہُوا
میرا دلِ حزیں ہے پریشاں مرے لئے

فرصت کہاں نصیب دلِ بے قرار کو
روز اک نیا ہے فکر کا ساماں مرے لئے

اس عالمِ جنونِ تمنّا میں عارفی
ہے بھی کہیں قرارِ دل و جاں مرے لئے

(کراچی ۱۹۵۳ء)

زہے قسمت کسی کے آستاں پر وہ میری زندگی کے چند لمحات
اگر ہو تابِ نظّارہ کسی کو اُٹھا دوں عارفی دل کے حجابات

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے جب کوئی مدعا نہیں ہوتا
آہ وہ عالمِ شکستِ دل جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

محبت میں یہ کیا کہئے کہ رازِ بیخودی کیا ہے؟
نہ گزرے اس طرح جو زندگی وہ زندگی کیا ہے

برابر ایک دُھن رہتی ہے تجدیدِ تمنا کی
خدا معلوم دل کو عافیت سے دُشمنی کیا ہے

ذرا دیکھے تو کوئی جلوہ ہائے دل کی رعنائی
معاذ اللہ بہارِ رنگ و بُو کی دلکشی کیا ہے

ترا دل ناشناسِ لذتِ دردِ محبت ہے
تجھے معلوم کیا ہمدم کہ لُطفِ زندگی کیا ہے

یہ بزمِ ناز میں آخر ترا کیا حال ہے ناصح
یہ آہِ زیرِ لب کیوں ہے یہ آنکھوں میں نمی کیا ہے

ذرا ہو تو اشارہ اُن کی چشمِ ناز کا اے دِل
ہزاروں زندگی قربان یہ اک زندگی کیا ہے

دلِ پُر آرزو کو وقفِ عیشِ زندگی کر دوں
مگر پھر سوچتا ہوں اعتبارِ زندگی کیا ہے

مرے جذباتِ پنہاں کا تجھے احساس کیا ہمدم
تو سمجھا ہی نہیں مرا مذاقِ زندگی کیا ہے

مجھے اے عارفی اب تک نہیں خود اس کا اندازہ
میں کس عالم میں ہوں میرا مقامِ بیخودی کیا ہے

(کراچی ۱۹۵۳ء)

عافیت ہی عافیت ہے بیخودی میرے لئے
ورنہ پیہم دردِ سر تھی زندگی میرے لئے

اللہ اللہ اُن کی بزمِ ناز کی نیرنگیاں
لُطفِ ناؤنوش سب کو بیخودی میرے لئے

کیا ضرورت کیوں کسی محفل میں میرا ذکر ہو
کیوں کسی کی آنکھ میں آئے نمی میرے لئے

زندگی نے کر دیا جینے کے ناقابل مجھے
جب ہوئی جینے کے قابل زندگی میرے لئے

ایک بھی جھونکا نہ لائی نکہتِ گُل کا کبھی
اے نسیمِ جانفزا یہ بے رُخی میرے لئے

ہوش ہی اچھا نہ اچھی بے خودی میرے لئے
اک معمّہ بن گئی یہ زندگی میرے لئے

چارہ سازی کر رہا ہے اُن کا لطفِ دل نواز
باعثِ صد عیش ہے یہ بے کسی میرے لئے

جلوہ ہائے زندگی کی تابشوں کو کیا کروں
ان میں کچھ بھی تو نہیں ہے دلکشی میرے لئے

عاؔرفی تنہائیوں میں اس کی کیفیت نہ پوچھ
شاعری گویا ہے شغلِ مے کشی میرے لئے

(کراچی ۱۹۵۲ء)

ہو گئیں مدتیں اُنہیں مجھ پہ نظر کئے ہوئے
دل کی تمام کائنات زیر و زبر کئے ہوئے
یاد ہے اُن کی اس طرح دل میں اثر کئے ہوئے
سب سے بنا کے بے خبر سب کو خبر کئے ہوئے
کوئی خیال ہی نہیں اُن کے خیال کے سوا
اب ہوں ہر اک خیال سے قطع نظر کئے ہوئے
پُوچھئے مجھ سے عاؔرفی لُطفِ حیات میکدہ
پیرِ مغاں کے در پہ ہوں عمر بسر کئے ہوئے

(کراچی ۱۹۵۲ء)

○

مَیں فیضانِ تصوّر کا بہت ممنون ہوں لیکن
اسے کیا کیجئے دل کو اگر تسکیں نہیں ہوتی
شرابِ بے خودئ شوق بھی کیا جانے کیا شے ہے
برابر پی رہا ہوں اور ذرا تسکین نہیں ہوتی
لئے پھرتا ہے ہر سُو مجھ کو میرا ذوقِ بے تابی
کہیں تسکیں نہیں ملتی کہیں تسکیں نہیں ہوتی

ہو بھی سکے گا مجھ سے بیاں بزمِ یار کا
اندازہ کر رہا ہوں دلِ بے قرار کا

اُٹھے نگاہ سے جو حجاباتِ رنگ و بُو
آیا نظر خزاں میں بھی عالم بہار کا

مانا کہ اضطرابِ مسلسل ہے زندگی
ہے بھی مگر کہیں کوئی عالم قرار کا

کُنجِ قفس میں ہوں کہ چمن میں خبر نہیں
بیخود کئے ہوئے ہے تصوّر بہار کا

جو وقت بھی سکوں سے گزر جائے نصیب
کیا اعتبار گردشِ لیل و نہار کا

افسردہ دل چمن میں بھی افسردہ ہی رہے
جادو چلا نہ کچھ بھی نسیمِ بہار کا

کچھ قلبِ مضطرب پہ قیامت سے کم نہ تھا
عالم رہا جو کشمکشِ انتظار کا

یہ کیا ستم ہے اے دلِ وارفتۂ چمن!
کُنجِ قفس میں اور تصوّر بہار کا

ہے وہ بلا جنونِ تمنّا کہ عارفی
دل کے لئے نہیں کوئی عنواں قرار کا

(کراچی ۱۹۵۱ء)

یاد اُن کی اس طرح دم ساز ہو کر رہ گئی
میرے دل کی بیخودی اک راز ہو کر رہ گئی
ایک بجلی سی گری جس دم قفس کا در کُھلا
بال و پَر میں جنبشِ پرواز ہو کر رہ گئی
الاماں اے احتیاطِ ضبطِ غم یہ کیا کیا
زندگی سرگرمِ سوز و ساز ہو کر رہ گئی
سوچتا ہوں اب کہ انجامِ محبّت کیا ہُوا
بات کیا تھی جو فقط آغاز ہو کر رہ گئی
اللہ اللہ میرے دل میں حسرتِ دیدارِ دوست
اب تو یہ حسرت ہی وجہِ ناز ہو کر رہ گئی
عارفیؔ پیرِ مغاں نے ایسی کچھ ڈالی نظر
میری ہستی مظہرِ اعجاز ہو کر رہ گئی

(کراچی - جون ۱۹۵۰ء)

للہ الحمد اب یہ عالم ہے کسی کی یاد میں
دیکھتا ہے جو مجھے کہتا ہے یہ دیوانہ ہے
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے یہ فریبِ زندگی
اک پریشاں خواب اک بے ربط سا افسانہ ہے

میری تمام زندگی ایک طلسم سر بسر
اُف یہ ہجومِ آرزو اُف یہ حیاتِ مختصر

اُن کے کرم پہ منحصر شرکتِ بزم ہے مگر
میری جبیں تو ہو چکی وقفِ نیازِ سنگِ در

بزمِ حوادثات میں کیا کہوں کس اُمید پر
ڈھونڈھ رہا ہوں آہ میں دل کا سکونِ منتشر

جوشِ جنونِ عشق کو ضبط تو کر لیا مگر
دل پہ جو کچھ گزر گئی اُس کی کسی کو کیا خبر

بن گئی اُن کی یاد جب لیل و نہارِ زندگی
اب مری شام شام ہے اب ہے مری سحر سحر

عرضِ نیازِ آرزو سہل نہ تھی مرے لئے
ہو گئی آہِ زیرِ لب دردِ نہاں کی پردہ در

میرے دلِ غریب پر دونوں کی ہیں نوازشیں
تابشِ حُسن الاماں آتشِ عشق الحذر

پیرِ مُغاں کے فیض سے رازِ حیات یہ کُھلا
بیخودی اصلِ زندگی ہوش تمام دردِ سر

مجھ سے نہ پُوچھ عارفیؔ میرے دلِ حزیں کا حال
اپنی خبر نہ ہو جسے اُس کو کسی کی کیا خبر

(جونپور۔ ۱۹۴۹ء)

جب کبھی محویتوں میں دل کی کھو جاتا ہوں مَیں
اپنے آغوشِ تصوّر میں اُنہیں پاتا ہوں مَیں

ہم سفر مجھ کو سمجھتا ہے کہ مَیں ہوں رہ نما
اور خود اُس کے سہارے ہی چلا جاتا ہوں مَیں

کرتی جاتی ہے سرایت جان و دل میں اُنکی یاد
رفتہ رفتہ جانے کیا سے کیا ہُوا جاتا ہوں مَیں

جب کبھی شوریدگانِ عشق کا ہوتا ہے ذکر
اے زہے قسمت کہ اُن کو یاد آ جاتا ہوں مَیں

اے دل آخر کیا ہُوا وہ عالمِ کیف و سرور
کیا سبب ہے سوزِ غم میں کیوں کمی پاتا ہوں مَیں

رحم کر اب اے فریبِ خود نمائی رحم کر
اب تو خود اپنی نگاہوں سے گِرا جاتا ہوں مَیں

الاماں میرے جنُونِ شوق کی وارفتگی
اُن کی دُزدیدہ نظر کی زد میں جب آتا ہوں مَیں

اب نہ منزل کی طلب ہے اور نہ منزل کا پتہ
ایک دُھن ہے اور اُسی دُھن میں چلا جاتا ہوں مَیں

اب کسی سے تلخیوں کی کیا شکایت کیا گِلہ
واقعاتِ زندگی خود بھُولتا جاتا ہوں مَیں

جس قدر محسوس ہوتا ہے کہ اُن سے دُور ہوں
اور بھی نزدیک تر دِل سے اُنہیں پاتا ہوں مَیں

پھر یہ کیا ہے گر نہیں اُن کی محبت کی کشش
خود بخود اُن کی طرف یہ کیوں کھنچا جاتا ہوں مَیں

ڈوب جاتا ہوں محبت کی فضائے ناز میں
جب کبھی اُن کی نظر اپنی طرف پاتا ہوں مَیں

سیر کر دے مجھ کو کم از کم بقدرِ آرزو
اے محبت تشنہ کامِ غم رہا جاتا ہوں مَیں

عارفی کچھ دِل کی خلوت ہی میں ملتا ہے سکوں
جب کبھی دُنیا کے ہنگاموں سے گھبراتا ہوں مَیں

(جونپور ۱۹۴۹ء)

ہر تعلق ہر خیال و فکر سے بیگانہ ہے
اب تو کچھ اپنی ہی دُھن میں یہ دلِ دیوانہ ہے

مَیں نے دیکھی تھی کبھی ساقی کی چشمِ مستِ ناز
آج تک آنکھوں میں میری کیفِ صد میخانہ ہے

اللہ اللہ سجدہ ہائے شوق کی وارفتگی
ذرہ ذرہ جیسے اب سنگِ درِ جانانہ ہے

مثلِ شمعِ سوختہ ہوں یادگارِ بزمِ دوست
میرے سوزِ غم کا حاصل عبرتِ افسانہ ہے

کیا غرض مجھ کو کہ کس کے جام میں ہے کیسی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

شرم آتی ہے درِ کعبہ پہ کیا منہ لے کے جائیں
اپنی پیشانی پہ داغِ سجدۂ بُت خانہ ہے

مَیں ہوں اب دُنیا و مافیہا کے غم سے بے نیاز
جام مے ہے بیخودی ہے گوشۂ میخانہ ہے

للہ الحمد اب یہ عالم ہے کسی کی یاد میں
دیکھتا ہے جو مجھے کہتا ہے یہ دیوانہ ہے

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے یہ فریبِ زندگی
اک پریشاں خواب اک بے ربط سا افسانہ ہے

ہے میسر کنجِ میخانہ میں معراجِ حیات
پائے ساقی پر ہے سر اور سجدۂ شکرانہ ہے

اپنی جس خوبی پہ چاہے ناز کر لے آدمی
چند دن کے بعد پھر افسانہ ہی افسانہ ہے

اپنی ہستی کی حقیقت کچھ نہ کچھ تو ہے ضرور
یہ حقیقت بھی مگر افسانہ ہی افسانہ ہے

کیا کسی سے کہئے رازِ بادۂ سرجوشِ عشق
عاؔرفی لب پر مرے مُہرِ لبِ پیمانہ ہے

(جونپور ۱۹۴۶ء)

کچھ تو ہو معلوم آخر رازِ دِل
ہوں سراپا گوش بر آوازِ دل

بے اثر ثابت ہُوا سب سوز و ساز
کُھل گیا آخر فریب نازِ دل

اب ہزار اس کو کوئی چھیڑے تو کیا
ہو چکا ہے بے صدا یہ سازِ دل

المدد پاسِ محبّت المدد
لب نہ ہونے پائیں ہم آوازِ دل

بارِ خاطر ہے بہارِ رنگ و بُو
اس طرح بدلا ہے کچھ اندازِ دل

رہ گئی گھِر کے حدودِ شوق میں
کچھ نہ نکلی ہمّتِ پروازِ دل

عشق تھا منزل بہ منزل دُور تر
رہ گئے تھک کر پرِ پروازِ دِل

رفتہ رفتہ آرزوئیں مِٹ گئیں
ہو گئیں حیرانیاں دم سازِ دِل

عارفیؔ جذباتِ خفتہ کو نہ چھیڑ
پھر بھڑک اُٹھے نہ سوز و سازِ دِل

(جونپور۔ ۱۹۴۶ء)

حقیقت میں بڑی دولت ہے جانِ مبتلا مجھ کو
بنایا ہے اسی نے بے نیازِ ماسوا مجھ کو
حریمِ دل سے باہر آکے ڈھونڈو تو ذرا مجھ کو
تمہاری یاد کی محویتوں نے کھو دیا مجھ کو
جہاں میں ہوں نہ میرا منتہائے آرزو کوئی
یہ میرے شوقِ بے حد نے کہاں پہنچا دیا مجھ کو
مرے اک اک قدم پر منزلِ مقصود قرباں ہے
ملا ہے خوبیٔ قسمت سے ایسا رہنما مجھ کو
مآلِ عشق میرا بے نیازِ عشق ہے یعنی
فنا ہو کر ملا ہے ایک عالم ہی نیا مجھ کو
بڑی پُر کیف ہوتی ہے مری خلوت کی خاموشی
سراپا محو رکھتا ہے دلِ با ماجرا مجھ کو
معاذ اللہ! وفورِ حسن وجوشِ عشق کا عالم
نہ احساسِ وفا اُن کو نہ ادراکِ جفا مجھ کو
سرِ مژگاں ہوا اشک آلود و مہرِ خامشی لب پر
اسی عنواں سے اب کرنا ہے شرحِ مدّعا مجھ کو
ترا ہر جلوۂ دل کش ہم آغوشِ خزاں نکلا
بڑا دھوکہ دیا تُو نے بہارِ جانفزا مجھ کو

دلِ مایوس کی رگ رگ کہیں پھر خوں نہ دے جائے
نہ دے اب آہ اے امید کوئی آسرا مجھ کو
ملانا ہے نظر پھر تیری برگشتہ نگاہوں سے
ابھی اک بار پھر کرنا ہے تیرا سامنا مجھ کو
یہی دل عارفی جولانگہِ فکرِ دو عالم تھا
اسی دل نے بنایا بے نیازِ ماسوا مجھ کو

(جونپور ۔ ۱۹۳۸ء)

O

زندگی وقفِ محبت ہو گئی — اور محبت بے نہایت ہو گئی
ہوں گے افسانے محبت کے کبھی — اب تو افسانہ محبت ہو گئی
کس نظر سے تم نے دیکھا تھا مجھے — جس نے دیکھا اُس کو حیرت ہو گئی
کُھل گیا اک بابِ تاویلات کا — میری خاموشی قیامت ہو گئی
خواب تھا خوابِ شبستانِ شباب — صبح ہوتے ہی قیامت ہو گئی
عمر بھر بن کر رہے آزارِ جاں — دل کو ارمانوں سے نفرت ہو گئی
کیا کریں اب ذکرِ عہدِ آرزو — اس کو بھولے بھی تو مدت ہو گئی
ہو گیا دل باریابِ بزمِ دوست — بند کی آنکھ اور خلوت ہو گئی
خوب تسکیں دی دلِ بیتاب کو — دردِ دل میں اور شدت ہو گئی
سہتے سہتے زندگی کی تلخیاں — رفتہ رفتہ دل کو عادت ہو گئی

عارفی کچھ ضبطِ غم آساں نہ تھا
رفتہ رفتہ دل کو عادت ہو گئی

(جونپور ۱۹۳۸ء)

اب ہے مری رُسوائی افسانہ در افسانہ
کیا کر دیا یہ تُو نے آخر غمِ جانانہ

تمکین و تن آرائی سب ہوش کی باتیں تھیں
جس حال میں بھی رکھے اب تو دلِ دیوانہ

نیرنگِ محبت کی اللہ رے فسوں سازی
وہ جانِ فسانہ ہیں مَیں عبرتِ افسانہ

میرے دلِ مضطر کی دُنیا ہی بدل ڈالی
اُف اُن کی نگاہوں کا اندازِ حریفانہ

کُھل جائے گرہ دل کی اے ضبطِ غمِ پنہاں
آجائے اگر لب پر اک نعرۂ مستانہ

اے عاؔرفی اب ایسی وارفتہ مزاجی ہے
خود اپنی نظر میں ہوں اک ہستیٔ بیگانہ

(جونپور ۱۹۳۸ء)

سرگشتگیٔ شوق کا اندازہ کیا اُسے
صہبائے چشم ناز کبھی جس نے پی نہیں

اب تو کر سکتے ہیں یہ احساس بھی مشکل سے ہم
کیا تھے اور کیا ہو گئے تاثیر دردِ دل سے ہم
ہے قدم راہِ طلب میں گو وہ ناقص ہی سہی
کچھ تو حاصل کر رہے ہیں سعیٔ لاحاصل سے ہم
یہ نہ سمجھے کار فرما ہے کسی کا لطفِ خاص
اپنی حالت سے رہے کچھ اس طرح غافل سے ہم
اے وفورِ شوق ان محرومیوں کا کیا علاج
ہے تو منزل پاس لیکن دور ہیں منزل سے ہم
دیکھتا ہے جو ہمیں سرشار ہو جاتا ہے وہ
اس طرح کچھ پی کے اٹھے ہیں تری محفل سے ہم
عارفؔی کچھ احتیاطِ ضبطِ غم کی حد بھی ہے
خود پھنکے جاتے ہیں اب تو اپنے سوزِ دل سے ہم

(جونپور جنوری ۱۹۳۴ء)

نہ سوزِ محبّت نہ سازِ محبّت — محبت ہے خود شرحِ رازِ محبّت
شبِ غم کی تنہائی ہے اور مَیں ہوں — مزا دے رہا ہے گدازِ محبّت
لہُو ہو کے دل بہہ گیا ضبطِ غم سے — نہ آیا مگر لب پہ رازِ محبّت
نہیں عارفی کچھ مزہ زندگی کا — نہ ہو دل میں جب تک گدازِ محبّت

محبّت کو خود ناز ہے میرے دل پر
مَیں ہوں عارفی پاک بازِ محبّت

(جونپور ۱۹۳۴ء)
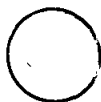
لُطف آتا ہے زمانہ کو جو دُہرانے میں — کوئی تو بات ہے آخر مرے افسانے میں
میری مستی پہ یہ کیوں جھوم گیا مے خانہ — تُو نے کیا بھر دیا ساقی مرے پیمانے میں
درِ کعبہ پہ وہی بن گیا شمعِ عرفاں — داغِ سجدہ جو ملا تھا مجھے بُت خانے میں

عارفی تھا مرے دل میں کبھی اک رازِ نہاں
اب وہی رُوحِ رواں ہے مرے افسانے میں

(جونپور-۱۹۳۶ء)

ہر چیز شگفتہ ہے بہار آئی ہوئی ہے
وہ دل کی کلی آہ جو مرجھائی ہوئی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے ہنسے دیتے ہیں آنسو
اِس ناز سے دل میں تری یاد آئی ہوئی ہے
کیا اُن سے کریں شکوۂ بیدادِ محبّت
جب اُن کی نظر آپ ہی شرمائی ہوئی ہے
لہراتی ہے اس میں بھی تری برقِ تبسّم
غم کی جو گھٹا دل پہ مرے چھائی ہوئی ہے
ڈر لگتا ہے اے عارفیِ احساسِ سکوں سے
اس درجہ طبیعت مری گھبرائی ہوئی ہے

(جونپور۔ ۱۹۳۴ء)

سوزِ نہاں سے پھونک دوں قلب و جگر مگر نہیں
اپنے مقامِ ضبط کی کیا مجھے کچھ خبر نہیں
کش مکشِ حیات کے مرحلے ختم ہو چکے
للہ الحمد اب کوئی حالتِ منتظر نہیں

مری آرزو کیا ہے کیا چاہتا ہوں
تمہیں سے یہ اب پُوچھنا چاہتا ہوں

فریبِ محبّت کی کچھ انتہا ہے
وفا کا صِلہ بھی وفا چاہتا ہوں

مجھے کیا غرض ہوش اور بیخودی سے
مَیں عالم ہی اپنا جُدا چاہتا ہوں

کہاں تک تمہارے تغافل کی حد ہے
ذرا یہ بھی اب دیکھنا چاہتا ہوں

جو ہونا تھا وہ ہو چکی حالتِ دِل
خدا جانے اب اور کیا چاہتا ہوں

لرز اُٹھتی ہے کائناتِ تمنّا
مَیں جب سازِ غم چھیڑنا چاہتا ہوں

وہی حال اچھا ہے جس میں وہ رکھیں
بہرحال اُن کی رضا چاہتا ہوں

عجب درد ہے عاؔرفی دردِ دل بھی
مَیں یہ درد حد سے سوا چاہتا ہوں

(جونپور ۱۹۳۴ء)

سازِ دلِ شکستہ نہ چھیڑا کرے کوئی
ناموسِ ضبطِ غم کو نہ رُسوا کرے کوئی

مجھ کو نظر بچا کے نہ دیکھا کرے کوئی
کیوں کائناتِ دل تہہ و بالا کرے کوئی

جتنا بھی چاہے غمزۂ بے جا کرے کوئی
کس کی مگر مجال کہ شکوہ کرے کوئی

اس ربطِ حُسن و عشق کا عالم ہی اور ہے
دل میں رہے اور آنکھ سے پردا کرے کوئی

تاثیرِ سوزِ غم، ترا انجام الاماں
کس کا جگر کہ تیری تمنّا کرے کوئی

جب دل ہے خود حریصِ تمنّائے بیقرار
ممکن نہیں کہ اس کا مداوا کرے کوئی

جی چاہتا ہے پھر وہ نگاہِ ستم طراز
میرے دلِ حزیں سے تقاضا کرے کوئی

اے ضبطِ غم اجازتِ یک آہِ جانگداز
کس طرح اور عقدۂ دل وا کرے کوئی

ذکر اُن کے حُسن کا کسی عنواں سے چھیڑ دے
پھر میری بیخودی کا تماشا کرے کوئی

اے نازِ ضبطِ غم یہ گوارا نہیں مجھے
جذباتِ دل میں حشر نہ برپا کرے کوئی

آخر کسی کے نازِ تغافل کی حد بھی ہے
کب تک نیازمندیٔ بے جا کرے کوئی

مَیں اپنے رازِ عشق کا محرم بنا تو لوں
میرا سا ظرفِ دل بھی تو پیدا کرے کوئی

مجھ سے نہ پوچھ سادگیٔ وعدہ ہائے دوست
کیا اپنے اعتبار کو رسوا کرے کوئی

بنتی نہیں ہے شرحِ تمنّا کئے بغیر
جب بن پڑے نہ یہ بھی تو پھر کیا کرے کوئی

جب اُن کو اعترافِ محبّت ہے عارفی
کیا اس سے بڑھ کے اور تمنّا کرے کوئی

(۱۹۶۳ء)

جب کبھی وہ ادھر سے گزرے ہیں　　کتنے عالم نظر سے گزرے ہیں

بس گئی ہے فضا میں نکہتِ حُسن　　وہ جہاں بھی جدھر سے گزرے ہیں

کتنے دلکش ہیں اُن کے نقشِ قدم　　جو تری رہگذر سے گزرے ہیں

نت نئے حُسنِ یار کے جلوے　　میری شام و سحر سے گزرے ہیں

دل پہ اِک تازہ چوٹ کھائی ہے　　جب بھی ہم اُن کے در سے گزرے ہیں

جب بھی گزرے ہیں وہ تصوّر میں　　پردۂ چشمِ تر سے گزرے ہیں

عارفی ہم کو بھی ہے اس پر ناز
ہم بھی اُن کی نظر سے گزرے ہیں

(کراچی ۱۹۶۳ء)

ہزاروں واقعات زندگی ہیں　　کہ جن کی یاد تک دل میں نہیں ہے
مگر کچھ سانحات زندگی ہیں　　کہ جن کا زخم دل میں جاگزیں ہے

دل کو تپشِ شوق کی یہ لذّتِ پیہم
مل تو گئی لیکن بڑی مشکل سے ملی ہے

مرا کیفِ نغمۂ دل، مرا ذوقِ شاعرانہ — ترے حسن کا ترنّم، ترے عشق کا ترانہ
ترے حُسن کی عطا ہے ترے عشق کا صِلہ ہے — مری آہِ صبح گاہی، مرا نالۂ شبانہ
تری شانِ بے نیازی کا مقام کس نے پایا — مری سجدہ گاہِ حیرت ترا حُسنِ آستانہ
تری یاد دے اجازت تو بتاؤں میں کہ ہے کیوں — مرا ہر نفس حقیقت مرا ہر نفس فسانہ
تری بے نیازیوں سے کوئی رازِ اس کا پوچھے — ترے غم میں ہو گیا کیوں مرا حال والہانہ
تری یاد کی خلش ہو ترے ذکر کی تپش ہو — مرے اشکہائے غم کو کوئی چاہیئے بہانہ

ترا ذکرِ روح پرور ہے زبان عارفی پر
بہ نوائے محرمانہ بحدیثِ دیگرانہ

(کراچی ۱۹۶۳ء)

دل پُر آرزو تیری بدولت
بہت عاجز بہت مجبور ہیں ہم
کسی کی یاد ہے اور لاکھ غم ہیں
مگر پھر بھی بہت مسرور ہیں ہم

وہی جلوے جو تھے آنکھوں سے پنہاں
انہیں جلوؤں میں اب مستور ہیں ہم
پتہ چلتا نہیں کچھ بے خودی میں
کہ اُن کے پاس ہیں یا دور ہیں ہم

محبّت کی جنوں انگیز جن راہوں سے ہم نکلے
بہت دشوار ہے کوئی اگر ثابت قدم نکلے

جنہیں ہم نے ہمیشہ دشمنِ اہلِ وفا سمجھا
حقیقت میں وہی در پردہ اربابِ کرم نکلے

نظر آنے لگا ہر سو وہی وجد آفریں عالم
کچھ ایسے وجد کے عالم میں اس محفل سے ہم نکلے

محبت میں ہمیشہ پردہ دارِ غم رہیں آنکھیں
وہ آنسو جن میں خونِ آرزو شامل ہو کم نکلے

ہوئی جب خستہ حالانِ محبت پر نظر اُن کی
ہمیں سب سے زیادہ قابلِ رحم و کرم نکلے

کبھی گھبرا کے دل نے جب کوئی کُنجِ سکوں ڈھونڈا
تو خود دل ہی کے ہر گوشہ سے جانے کتنے غم نکلے

محبت میں جنہیں شائستۂ پاسِ وفا کہئے
تکلّف بر طرف ایسے نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

انہی کو عارفی لذت کشِ دردِ نہاں پایا
محبت میں جو دل آسودۂ آشوبِ غم نکلے

وہ وقفِ خزاں ہی سہی ہم نفس — چمن پھر چمن ہے قفس پھر قفس

حاصلِ ذوقِ طلب صحرا و گُلشن میں نہیں
میری آنکھوں میں وہ جلوے ہیں جو ایمن میں نہیں

کیا کروں گر موسمِ گل ہے جنوں افزائے شوق
ایک بھی تار اب تو میری جیب و دامن میں نہیں

اے دلِ بیگانۂ ذوقِ تماشائے بہار
جلوہ ہائے لالہ و گل صرف گلشن میں نہیں

عمر بھر گل چینیاں کیں ہیں ریاضِ حسن میں
کون سا وہ پھول ہے جو میرے دامن میں نہیں

بعد مدت اب قفس کا در کھلا تو کیا کھلا
دیکھتا ہوں چار تنکے بھی نشیمن میں نہیں

خندہ بر لب کینہ در دل زہر اندر انگبیں
دوست میں وہ بات پاتا ہوں جو دشمن میں نہیں

کشتگانِ فتنۂ رنگین خار و گُل سے پوچھ
کیا نشاطِ دلِ قفس میں ہے جو گلشن میں نہیں

جو کسی دل کے تکدر کا سبب ہو عارفی
کوئی ایسا داغ میرے قلبِ روشن میں نہیں

عارفی ناموسِ ضبطِ غم کو رسوا کیا کریں
کیا بتاؤں کیوں اثر اب میرے شیون میں نہیں

دل دے کے پھر نہ کچھ ہوسِ زندگی ہوئی
ہر ماسوا سے اب ہے طبیعت ہٹی ہوئی

لمحاتِ انتظار کا احساس الاماں !
جیسے ہوں کائنات کی نبضیں رُکی ہوئی

جس رہ گذر سے وہ کبھی گزرے ہیں ایک بار
اب تک ہے جلوہ گاہِ تحیّر بنی ہوئی

اے نشترِ نگاہِ کرم اتنا رحم کر !
دل کی وہ رگ نہ چھیڑ جو رگ ہے دُکھی ہوئی

ایسا نہ ہو بھڑک اُٹھے اے آہِ مضطرب
مدت سے ہے جو آگ سی دل میں دبی ہوئی

وہ شعر ہی نہیں ہے نہ ہو جس میں عاؔرفی
سوز و گدازِ عشق کی لذت بھری ہوئی

حشر پر وعدہ دیدار اُٹھا رکھا ہے
طالبِ دید کو دیوانہ بنا رکھا ہے

عشق نے دیکھ کے وارفتۂ لذت مجھ کو
دردِ دل میں مرے کچھ جلدسے سوا رکھا ہے

اس طرح کچھ التفاتِ چشمِ افسوں ساز ہے
میرے دل کی ہر تمنّا محوِ خوابِ ناز ہے
جذب ہو کر رہ گیا آنکھوں میں حسنِ روئے دوست
اب مرا ذوقِ نظر ہی جلوہ گاہِ ناز ہے
مجھ سے انجامِ گدازِ غم کی کیفیّت نہ پوچھ
دل ابھی مدہوشِ کیفِ لذّتِ آغاز ہے
کچھ یہی محسوس ہوتا ہے وفورِ شوق میں
ہر ادائے دوست جیسے میرے دل کا راز ہے
کس طرح رازِ محبّت پھر رہے رازِ نہاں
عارفیؔ جب حسن ہی خود فطرتاً غمّاز ہے

غضب کا سوز ہے میرے دلِ مضطر کی آہوں میں
یہ کس نے آگ سی بھر دی نگاہوں ہی نگاہوں میں

کیا کہوں جب دل میں پاتا ہوں تمنائے سکون
کس قدر محسوس ہوتی ہے کمی تیرے بغیر

خلوت میں ہے یہ عیش کا ساماں مرے لئے
جیسے ہو کوئی دل میں غزل خواں مرے لئے

اس طرح جان و دل میں سمائے ہوئے ہیں وہ
ایک ایک رگ ہے اب تو رگ جاں مرے لئے

اے عشقِ جاں گداز اب ایسا نہ ہو کہیں
ہونا پڑے کسی کو پشیماں مرے لئے

بے مہریٔ زمانہ سے دل سرد ہو گیا
آئی نہ راس صحبتِ یاراں مرے لئے

یارب بہار آتے ہی آخر یہ کیا ہوا
بدلا ہوا ہے رنگ گلستاں مرے لئے

احساس ہے تجھے بھی کچھ اے کشتۂ ستم
ہونا پڑا ہے کس کو پشیماں مرے لئے

سرمایۂ حیات محبت ہے عارفی
پیہم یہ اضطرابِ رگ جاں مرے لئے

—•—

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اک اک گوشۂ اُمید میں
وہ نشاطِ زندگی جس کی تمنا دل میں ہے

—•—

پھر دیکھنا سرگشتگیٔ توبہ کا عالم   آنے تو دو اک بادۂ ساغر کی ذرا یاد

مرے دل پہ اُن کی نظر اللہ اللہ
یہ دِل اب دلِ معتبر اللہ اللہ

محبت میں راہِ وفا ہے تو دِل کش
مگر ہے بڑی پُر خطر اللہ اللہ

اُدھر بحرِ غم کے بلاخیز طوفاں
اِدھر میرے قلب و جگر اللہ اللہ

خود اپنی ہی منزل ہوں خود راہ رو ہوں
مگر کون ہے ہم سفر اللہ اللہ

دلِ مبتلا کو غمِ آرزو سے !
کہیں بھی نہیں ہے مفر اللہ اللہ

فلک بھی مخالف زمیں بھی مخالف
وہ دن ہو گئے سب بسر اللہ اللہ

خود اپنی ہی ہستی سے خود بیں نگاہیں
مجھے لے گئیں دور تر اللہ اللہ

مری زندگی عارفی اک فسانہ
یہ نیرنگِ شام و سحر اللہ اللہ

کیا اب یہاں سے منزلِ مقصود ہے قریب
اک اک قدم پہ پوچھتے ہیں راہبر سے ہم

ہوس کو ہے نشاطِ کامرانی — معاذ اللہ جنونِ زندگانی
سما کر رہ گئے ہیں جان و دل میں — مگر اب تک وہی ہے لن ترانی
میری ہر آہ آہِ بے اثر ہے — وفورِ یاس تیری بدگمانی
یہ کیا کہئے کہ وہ کیوں سرگراں ہیں — محبت خود ہے وجہِ سرگرانی
دلِ وارفتہ کے رنگیں فسانے — سُنا کرتا ہوں خود اُن کی زبانی
مَیں ہوں اب بے نیازِ ہر دو عالم — خیالِ یار تیری مہربانی
غنیمت ہیں یہ دو دن زندگی کے — انہیں میں ہے حیاتِ جاودانی

مرے اشعار ہی میں عارفی ہے
مرے احساسِ غم کی ترجمانی

تھی بہت گرم ان کی محفلِ ناز
آہ اسنے بے خودی کہاں تھے ہم
دیکھتے ہیں بہارِ رنگ و بُو
سوچتے ہیں کبھی جواں تھے ہم
دل کی تنہائیوں کا کیا کہنا
آپ ہی آپ سے جہاں تھے ہم
کوئی ڈھونڈے گا اور نہ پائے گا
کون تھے کب تھے اور کہاں تھے ہم

کیسی بہاریں کیسا گلشن
ہاتھ میں ہے جب اُن کا دامن

حسرتِ دید اس برق نظر کی
ہوش میں آ او ہوش کے دشمن

دل نے بنایا شوق کو رہبر
شوق ہی نکلا دل کا رہزن

اس کے کرم سے نا ممکن ہے
میں ہی رہوں اک خالی دامن

اُن کی تجلی کا یہ اثر ہے
بند ہیں آنکھیں دل ہے روشن

عارفی اب کیا غیر کا شکوہ
اپنا دل ہے اپنا دشمن

ذکر تھا اُن کی بزم میں اہلِ وفا کا عارفی
میں انہیں یاد آگیا یہ بھی کمال ہو گیا

کاش دَم بھر کے لئے ملتا سکونِ زندگی
جانے کتنے دل اسی ارمان میں خوں ہو گئے

بن کر آہِ آتشیں لب پر نہ آجائے کہیں
وہ گدازِ غم جو اِک مدت سے پنہاں دل میں ہے

دل کی محویت کو عیشِ زندگی سمجھا ہوں میں
ہوش کو سامانِ شوریدہ سری سمجھا ہوں میں

رات دِن ہوں بے خودِ لذاتِ نیرنگِ ہوس
وائے نادانی اسی کو زندگی سمجھا ہوں میں

جا رہا ہوں دَیر سے گھبرا کے سوئے میکدہ
بعد مدت رازِ ہوش و بیخودی سمجھا ہوں میں

خود محبت ہی محبت کا صلہ ہے فطرتاً
بے نیازِ مدعا ہو کر یہی سمجھا ہوں میں

جب سے ہے احساس فیضانِ محبت عارفی
دردِ دل کو وجہ لطفِ زندگی سمجھا ہوں میں

میرے جنونِ شوق کا وہم ہے یہ نہیں نہیں
حسنِ یقیں کی ہے قسم اُن سا کوئی حسیں نہیں
جلوے تو سب انھی کے ہیں خود وہ مگر مکیں نہیں
اتنی حسین چیز دل پھر بھی ابھی حسیں نہیں
میکدۂ خیال دوست اور یہ کیف بےخودی
ایسا سرورِ زندگی ہے بھی کہیں، کہیں نہیں
جذب و جنوں کی واردات کس کو سناؤں عارفی
محرم پیچ و تابِ دل ایک بھی ہم نشیں نہیں

ہے بقدر ہمتِ دل جادۂ ذوق طلب
بیٹھ جاؤں میں جہاں تھک کر مری منزل وہی
یا تو ہر احساسِ غم اسے بےخودی کر دے فنا
یا عطا کر پھر سے مجھ کو میرا دردِ دل وہی

—•—

دلِ پُر شوق سے غم کی فراوانی نہیں جاتی
مزاجِ عشق کی تاثیرِ پنہانی نہیں جاتی

وہ آغازِ محبت ہو کہ انجام محبت ہو
جنونِ شوق کی شوریدہ سامانی نہیں جاتی

دلِ بے تاب کو حاصل حضوری ہو کہ مہجوری
کوئی عالم بھی ہو اشکوں کی طغیانی نہیں جاتی

تمناہائے گوناگوں سے دل معمور ہے لیکن
مزاجِ عشق کی بے سازو سامانی نہیں جاتی

دلِ مایوس پر چھائی ہوئی ہیں ظلمتیں لاکھوں
مگر پھر بھی امیدوں کی درخشانی نہیں جاتی

مجھے تیرے تغافل نے وہاں پہنچا دیا آخر
جہاں تیری نظر بھی اب بآسانی نہیں جاتی

انہیں اسے عاؔرفی دیکھا ہے مَیں نے ایسے عالم میں
کسی صورت سے اب آنکھوں کی حیرانی نہیں جاتی

ہوں خریداروں میں اُن کے نہ طلبگاروں میں
ناز ہے مجھ کو کہ ہوں اُن کے پرستاروں میں

جس کسی کو بھی ترا عشق بنا لے اپنا
پھر وہ دیوانوں میں رہتا ہے نہ ہشیاروں میں

کارفرما ہے مگر تیرے کرم کی شوخی
ورنہ یہ جرأتِ تقلید خطاکاروں میں

ایک بھی تو نہ ہوا حقِ محبت پورا
ہم سمجھتے تھے کہ ہم بھی ہیں وفاداروں میں

سرِ شوریدہ نے زنداں کو نہ رکھا زنداں
در ہی در اب تو نظر آتے ہیں دیواروں میں

نہیں ممکن ادا ہو حق تری بندہ نوازی کا
اگر انساں سراپا بھی زبانِ شکر بن جائے

کیا ہے اپنے دل کو جب سے محوِ بیخودی میں نے
بڑی پُرکیف کر لی اپنی ساری زندگی میں نے

نیرنگِ فضائے شام و سحر یہ جوشِ بہار و موسمِ گل
ہر منظرِ دلکش فرقت میں دیوانہ بنانیوالا ہے

کچھ دنوں اور ابھی آنکھ سے ٹپکے گا لہو
نشترِ کاوشِ غم چھیڑ رہا ہے دل کو

مرا جذبۂ شوق کام آ رہا ہے
اُدھر سے بھی اب تو پیام آ رہا ہے
شبِ ہجر اک ربطِ پنہاں ہے اُن سے
تسلی کا پیہم پیام آ رہا ہے
وہی کر رہے ہیں مرے دل سے باتیں
اُنہیں کا زباں پر کلام آ رہا ہے
جہاں ختم ہوتا ہے افسانۂ دل
وہی عارفی اب مقام آ رہا ہے

○

یاد آ رہی ہے صحبتِ یارانِ میکدہ
تڑپا رہی ہے فرقتِ جانانِ میکدہ
کیا بات بے خودی میں ہے جو ہوش میں نہیں
یہ راز کچھ سمجھتے ہیں رندانِ میکدہ
ساقی نے لطفِ خاص کے دریا بہا دیئے
نزدیک و دور یکساں ہے فیضانِ میکدہ
آساں نہیں ہے عارفی آدابِ مے کشی
ہوتا ہے ایک عمر میں عرفانِ میکدہ

منظرِ رازِ حقیقت ہوگئی
زندگی اب خود محبت ہوگئی

خوب تھا خوابِ شبستانِ شباب
صبح ہوتے ہی قیامت ہوگئی

کیا کروں اب ذکرِ عہدِ آرزو
اس کو بھولے بھی تو مدت ہوگئی

ہوگیا دل باریابِ بزمِ دوست
بند کی آنکھ اور خلوت ہوگئی

عمر بھر بن کے رہے آزارِ جاں
دل کو ارمانوں سے نفرت ہوگئی

خوب تسکیں دی دلِ بے تاب کو
دردِ دل میں اور شدت ہوگئی

سہتے سہتے زندگی کی تلخیاں
رفتہ رفتہ دل کو عادت ہوگئی

شعر میں ڈھلنے لگا غم عارفیؔ
دل کے بہلانے کی صورت ہوگئی

◆◆◆

غم جو صبر آزما نہیں ہوتا — عقدۂ دل بھی وا نہیں ہوتا
نالہ دل سے جو لب تک آجائے — وہ کبھی نارسا نہیں ہوتا
حسن کو نازِ بے نیازی ہے — وہ کبھی بے وفا نہیں ہوتا
اے دلِ بیقرار جذبۂ شوق — اپنا چاہا ہُوا نہیں ہوتا
کیا علاج اُس کی بے خیالی کا — دردِ دل لا دوا نہیں ہوتا
ہر تقاضائے دل محبّت میں — قابلِ اعتنا نہیں ہوتا
کیا شکایت کریں زمانہ کی — وقت سب ایک سا نہیں ہوتا
کیا بتائیں کہ دل پہ کیا گزری — اس محبت میں کیا نہیں ہوتا
خون جب تک نہ ہوں تمنّائیں — اعتبارِ وفا نہیں ہوتا
دل کا عالم ہی اور ہوتا ہے — جب کسی سے گِلہ نہیں ہوتا
اُن سے ملنے میں لُطف آتا ہے — جب کوئی مدعا نہیں ہوتا
وہ تصوّر میں جب نہیں ہوتے — بے خودی میں مزا نہیں ہوتا
ہم سے ذکر اُن کے لطفِ پنہاں کا — کچھ بھی ہو برملا نہیں ہوتا
اُن کی نسبت ہو جب نگاہوں میں — ماسوا ، ماسوا نہیں ہوتا
آہ وہ عالم شکستِ دل — جب کوئی آسرا ، نہیں ہوتا

عارفی دعوئ وفا کیا ہے
جب کوئی حق ادا نہیں ہوتا

(۱۹۶۳ء)

اے عارفی اپنے دلِ پرشوق کی باتیں
اچھا ہے کہ تو اپنی زباں ہی سے سنائے
ممکن ہے کوئی کاشفِ اسرارِ محبت
پھر محفلِ احباب میں آئے کہ نہ آئے

کسی کی دھن میں محو لذتِ ذوقِ نظر ہو کر
میں گزرا ہوں جہانِ رنگ و بُو سے بے خبر ہو کر

—•—

ہر ذرّہ ترے کوچہ کا آنکھوں سے لگا لوں
ممکن ہے کسی پر ترا نقشِ کفِ پا ہو

—•—

آج کا دن بہت غنیمت ہے کل خدا جانے کیا قیامت ہو

—•—

کبھی اپنی کبھی اوروں کی فکریں غرض دل کو کبھی فرصت نہیں ہے

—•—

زندگی کی گردشوں سے اس طرح ہیں بدحواس
سوچتے ہیں آج اس دنیا میں جیسے ہم نہیں !

ہر وقت یاد آتے ہیں وہ بات بات پر
دل سے بہت قریب ہیں گو ہیں نظر سے دور

—•—

اب کہاں وہ گرمئ سوز و گداز ہا و ہو
بزم اہلِ دل ہے سُونی عاؔرفی تیرے بغیر

—•—

کیا چیز ہے یہ جلوہ گرِ حُسنِ تصوّر
کیا کہئے نظر آتا ہے تاحدِ نظر کیا

—•—

مجھے بزم طرب میں زحمتِ شرکت نہ دے ہمدم
کہیں ایسا نہ ہو ساری فضا بے کیف ہو جائے

—•—

اپنے دل کی جلوہ گاہِ حُسن تھی پیشِ نظر
کیا بتاؤں بے خودی میں کیا نظر آیا مجھے

—•—

تجھ میں اعجازِ جاں نوازی ہے   اے نسیمِ بہار رہنے دے

—•—

جن امیدوں کے تصوّر میں تھا فردوسِ حیات
دفعتہً دیکھا کہ سب خوابِ پریشاں ہو گئیں

—•—

تجھ کو کیا معلوم اے جانِ نشاطِ زندگی
کس قدر بے کیف ہیں شام و سحر تیرے بغیر

مجھے نائو نوش کا ہوش تھا نہ خبر تھی گردش جام کی
مَیں شریک محفلِ ناز تھا بہ ہزار عالم بے خودی

—•—

یُوں آج اُن کی یاد مَیں کچھ بے خودی سی ہے
خود اپنے حال پر مرے لب پر ہنسی سی ہے

—•—

اس طرح بدلا مذاقِ دل خیالِ یار نے
کوئی دلچسپی نہیں دُنیا میں اب میرے لئے

—•—

دل ڈھونڈتا ہے اب تو کوئی کُنجِ عافیت
گھبرا گیا ہوں گردشِ لیل و نہار سے

—•—

مَیں دیکھتا ہی رہ گیا نیرنگِ صبح و شام
عمر فسانہ ساز گزرتی چلی گئی

—•—

گری گری سی طبیعت بُجھا بُجھا سا دل
کچھ ان دنوں یہی اندازِ زندگانی ہے

تقدیر سے مل بھی جاتے ہیں اخلاص و محبّت والے دل
یہ چیز ابھی تک دُنیا میں کمیاب تو ہے نایاب نہیں

—•—

مرے ہمراہ چلنا ہے تو اے ہمدم سنبھل کر چل
مَیں جس رخ پر ہوں اس رخ پر ہوائیں تیز چلتی ہیں

—•—

کیسے ہم اس آستانہ سے اُٹھے   دیکھنے والوں سے پُوچھا چاہیئے

—•—

ساری دنیا بھی مخالف ہو تو کوئی غم نہیں
سب گوارا ہے مزاجِ یار گر برہم نہیں

۱۹۶۴ء ـــ ۱۹۸۶ء

سُنتا ہوں! ہیں مرقّعِ تنویرِ حسنِ دوست
پھر دیکھتے ہیں غور سے داغِ جگر مجھے

اب کہاں سے لاؤں پھر وہ کیفِ صہبائے سخن
عارفی طبع رسا کی تازگی جاتی رہی!

نئے انداز سے سکھلائے ہیں آدابِ مے نوشی
کریں گے یاد مجھ کو مدتوں رندانِ مے خانہ

پہنچے ہم بے خودئ دل میں جہاں تک پہنچے
یہ مگر ہوش نہیں ہے کہ کہاں تک پہنچے

ہے رہینِ غمِ عشق اپنی متاعِ دل و جاں!
بات ایسی نہ ہو جو سود و زیاں تک پہنچے

حسنِ اخلاقِ نبیؐ کا ہے یہ اک گلدستہ
کیا عجب اس کی مہک باغ جناں تک پہنچے

عارفی آستاں جن کا ہے مقامِ محمود
کاش یہ[1] ہدیۂ اخلاص وہاں تک پہنچے

---

[1] اسوۂ رسول اکرمؐ حضرت عارفی کی ایک مشہور و معروف تصنیف

ہجر کی شب یاد اُن کی دل کو بہلاتی رہی
لذّتِ دردِ نہاں سے نیند سی آتی رہی

میرے ذوق و شوق کی تنویر میں ڈوبی ہوئی
اُن کی تصویرِ خیالی سامنے آتی رہی

عشوہ ہائے حسنِ رنگیں کی بہارِ دل نواز
میری بزمِ بیخودی میں پھول برساتی رہی

دل میں جو عالم تھا اُن کی یادِ صبر آشوب کا
آنسوؤں میں اُس کی ہلکی سی جھلک آتی رہی

عاؔرفی تھا اس طرح درپردہ اُن کا لطفِ خاص
مجھ کو اپنے دل کی بے صبری پہ شرم آتی رہی

اللہ اللہ میرے احساسات کی سرمستیاں
سیلِ مے بن کر محبت دل میں لہراتی رہی

میرے جذباتِ محبت کی نوائے سوزِ غم
مدتوں تک بزم اہلِ دل کو تڑپاتی رہی

مجھ سے ترکِ جذبۂ ایثار ممکن ہی نہ تھا
اور دنیا میرے اس جذبے کو ٹھکراتی رہی

عمر بھر دل میں رہا ہیجانِ شوقِ ناتمام
ہر ادائے دوست میرے دل کو تڑپاتی رہی

اب کہاں سے لاؤں پھر وہ کیفِ صہبائے سخن
عاؔرفی طبعِ رسا کی تازگی جاتی رہی

بعد نازِ شباب رنگ و بو مستانہ وار آئی
دیارِ دوست میں ہوتی ہوئی شاید بہار آئی

کسی کے حسنِ رنگیں کا مرقع بن گیا گلشن
ہزاروں جلوہ ہائے نو بنو لے کر بہار آئی

نہ پوچھو بے خودیِ انتظارِ فصلِ گل ہم سے
خزاں میں بھی یہی محسوس ہوتا ہے بہار آئی

تبسم زیرِ لب یہ کون آیا پرسشِ غم کو
خزاں کے دور میں یارب کہاں سے یہ بہار آئی

چمن میں اہل دل اہل نظر کے درسِ عبرت کو
کبھی دورِ خزاں آیا کبھی فصلِ بہار آئی

انہی رنگیں فضاؤں میں جلے ہیں آشیاں کتنے
لرز جاتا ہوں جب سنتا ہوں گلشن میں بہار آئی

ہوئے ہیں جب سے ہم آسودۂ نیرنگیِ گلشن
نہ پھر شامِ خزاں آئی نہ پھر صبحِ بہار آئی

ذرا صبر اے دلِ مایوس یہ قانونِ فطرت ہے
کہ جب شامِ خزاں آئی تو پھر صبحِ بہار آئی

کہیں خود اپنے جلوؤں میں کہیں حسنِ تصور میں
چمن میں بھی بہار آئی قفس میں بھی بہار آئی

دلِ پُر شوق کو کیا جانے کیوں تسکیں نہیں ہوتی
ہزاروں حُسن کے جلووں میں آنے کو بہار آئی

مِرا دل جلوہ ہائے حسن رنگیں کا مرقّع ہے
مِری کیف نظر سے لالہ و گل میں بہار آئی

یہی دیکھا کئے ہم عارفی نیرنگیِ فطرت
بہار آئی خزاں آئی خزاں آئی بہار آئی

○

دُھواں سا دل سے اُٹھا لب پر آہِ بے قرار آئی
کسی کی یاد اس انداز سے بے اختیار آئی

چراغاں ہو گیا میرے شبستانِ تصوّر میں
نہ جانے کتنے عالم لے کے شام انتظار آئی

قیامت ہو گیا اظہارِ نفسِ مدعا مجھ سے
تمنّا جو زباں پر آئی ہو کر بے قرار آئی

رہے ہم ایسے محوِ حسنِ نیرنگِ چمن بندی
نہ جانے کب خزاں آئی نہ جانے کب بہار آئی

نہ پوچھو لغزشِ ذوقِ طلب راہ محبت میں
اُسی منزل پہ بھٹکا ہوں جو منزل سازگار آئی

مُجھے تو عارفی محویّتِ طبعِ رسا اپنی!
ہجومِ فکر و غم سے چھوٹنے میں سازگار آئی

اب میری نگاہوں میں نہ دنیا ہے نہ دیں ہے
اے دوست! محبّت بھی عجب سحر مبیں ہے!

میرے دلِ پرشوق کی مخمور فضا میں
اک عالمِ حیرت ہے فلک ہے نہ زمیں ہے

اے دوست ترے در سے اٹھی ہے نہ اٹھے گی
یہ ایک پشیمانِ محبّت کی جبیں ہے

یوں دیکھ رہا ہوں نگۂ لطف کسی کی
جیسے مرے دل میں کوئی حسرت ہی نہیں ہے

خود ہی حرمِ دل میں اُتر آیا ہے کوئی
اب میری نظر سوئے لب بام نہیں ہے

کچھ حسنِ نظر ہی کی کمی ہو تو ہو ورنہ
دنیائے محبّت کی ہر اِک چیز حسیں ہے

اُن کے حرمِ ناز میں اللہ یہ عالم
قابو میں نہ آنکھیں ہیں نہ دل ہے نہ جبیں ہے

شاید ہے محبّت میں یہ معراج تمنّا
ان کو بھی مرے پاس محبت کا یقیں ہے

میں عارفی آسودۂ خلوت گہ دل ہوں
اب میرے لئے گردشِ ایام نہیں ہے

رازِ سرمستیٔ دل ہوش میں آلوں تو کہوں
یا پھر اک بار نظر اُن سے ملالوں تو کہوں

مَیں نے کس عالمِ رعنائی میں دیکھا تھا انہیں
دلِ وارفتۂ حیرت کو سنبھالوں تو کہوں

کیا کہوں شوخیٔ ایمائے نگاہ ساقی
ایک جام اور ذرا لب سے لگالوں تو کہوں

دل میں کیا کیا ہیں محبت کے تقاضے پنہاں
خلشِ شوق ذرا اور بڑھالوں تو کہوں

اُن سے کہنا تو ہے حالِ دلِ پرشوق مگر
پہلے کچھ اور حکایات سنالوں تو کہوں

ان کے شایانِ کرم میری طلب ہے کہ نہیں!
اپنا دامانِ تہی ان کو دکھا لوں تو کہوں

ان سے کیوں شکوۂ بیداد تغافل ہے مجھے
اپنے دل پر بھی کچھ الزام لگالوں تو کہوں

مجھ پہ کیا کیا ہوئے اربابِ کرم کے احسان
دل پہ گزری ہے جو کچھ اُس کو بھلا لوں تو کہوں

عارفی جلوہ گہ ناز محبت کیا ہے
دل سے کچھ اور حجابات اُٹھا لوں تو کہوں

قرار آیا تو یوں بے تابیٔ دل کو قرار آیا
جب اُن کا نام لب پر بیخودی میں بار بار آیا
بہار آئی تو گلشن میں مگر بے سوز و ساز آئی
کوئی آتش نوا آیا نہ کوئی دل فگار آیا
یہی دیکھا ہے ہم نے ان کی بزم ناز کا عالم
جو اُٹھا بے قرار اُٹھا جو آیا بے قرار آیا
یکایک کھل گئے دل پر تمام اسرارِ میخانہ
مری آنکھوں میں جب ساقی کی آنکھوں کا خمار آیا
نشاطِ زندگی ہے سوز و سازِ عشق سے حاصل
مجھے تو عارفی یہ غم بہت ہی سازگار آیا
نہ پوچھ اے عارفی کیفیتِ سوز و گداز دل
زہے قسمت جسے دردِ محبت سازگار آیا

جب نام کسی کا سُنتا ہوں خاموش تو رہتا ہوں لیکن
اک جوش سا دل میں اُٹھتا ہے اک نشہ سا چھاجاتا ہے
یہ حال ہے اب تنہائی کا یہ عالم ہے بے کیفی کا
جو بزم ہو عیش و عشرت کی اس بزم سے دل گھبراتا ہے

نیاز و نازِ محبت کا اب ہے یہ عالم
نہ شکوۂ ستم اُن سے نہ التجائے کرم

نہ دے فریبِ اثر اور اے گدازِ غم
دلِ حزیں پہ ہیں تیری نوازشیں کیا کم

انھی کو حاصلِ سعئ وفا سمجھتا ہوں
کسی کی راہِ طلب میں جو اُٹھ گئے ہیں قدم

یہی نہ سمجھے کہ ہے حاصلِ محبت کیا
رہے کچھ اس طرح وارفتۂ محبّت ہم

ہر ایک گام پہ احساسِ قربِ منزل ہے
سنبھل رہا ہوں مگر ڈگمگا رہے ہیں قدم

کسی کو محرمِ لذّاتِ بےخودی کرلیں
نہ جانے ہوش میں آئیں کہ پھر نہ آئیں ہم

نہ چھیڑ عارفیؔ افسانۂ شکستِ دل
مزاجِ پاسِ محبّت کہیں نہ ہو برہم

اُن* سے حاصل ہے جب اک رابطہ دل پیہم
پھر تو ہے جانِ تمنّا وہ ستم ہو کہ کرم
شدتِ غم میں بھی اکثر یہی احساس رہا
جیسے دیتا ہو کوئی دل کو تسلّی پیہم
اہلِ دل کے لئے ایسا نہ ہو افسانہ بنے
جانے کیا کہہ گئے وارفتگیٔ شوق میں ہم
عارفی فکرِ رسا ہو نہ سکی وجہ سکوں
ہوگیا اور بھی کچھ نظمِ دل و جان برہم
عارفی میرا وقارِ لبِ خاموش نہ پوچھ
دل میں پوشیدہ کئے ہوں غمِ ہستی کا بھرم

عشوۂ حسنِ تغافل ہے شعارِ نازِ دوست
یا تو پھر میرے ہی جذبِ شوق کی تقصیر ہے
عارفی میرا ہی دل ہے تشنہ کامِ آرزو
یا محبت خود ہی اب تک تشنۂ تعبیر ہے

راہِ طلب میں ایسا بھی آیا تھا اک مقام
گم ہو گیا تو پھر نہ ملا ہم سفر کو میں
ہے بھی نیازِ عشق کے قابل متاعِ دل
پہلے دِکھا تو لوں کسی اہلِ نظر کو میں
آساں نہیں تصادمِ جذباتِ حُسن وعشق
اپنی نظر بچاؤں کہ اُن کی نظر کو میں

جب دل ہُوا لذت کش وجدانِ محبّت
ہر سمت محبّت ہی محبّت نظر آئی
دیکھا جو زمانے کو محبّت کی نظر سے
دل ہی نظر آیا نہ محبّت نظر آئی

میرے دلِ حزیں کو تسکین دینے والے
تُو نے تو ضبطِ غم کے سب بند توڑ ڈالے
اے عارفی یہی ہے بس رازِ عافیت کا
سب کام اپنے کر دے اللہ کے حوالے

پرسشِ غم ہی تسلّی کے لئے کافی ہے
کیا کہیں اور محبت کا تقاضہ کیا ہے

دیکھ کر میرا مذاقِ خدمتِ جام و سبو
میکدے والے مجھے پیرِ مغاں کہنے لگے

اے خیالِ دوست اے بے گانہ سازِ ماسوا
اس بھری دُنیا میں تونے مجھ کو تنہا کر دیا

سب لوگ دیکھتے رہے اُن کا خرام ناز
ہم تھے کہ اُن کا نقشِ قدم دیکھتے رہے

ڈوب جاتا ہوں تصوّر کی فضائے ناز میں
یہ وہ بحرِ بیکراں ہے جس کا ساحل ہی نہیں

پا رہا ہوں ہر قدم میں انجذابِ کوئے دوست
اب مرا ذوق طلب آوارۂ منزل نہیں

مدتوں سے ہم ہی ہیں عہد وفا بھولے ہوئے
پھر کسی سے بے رخی کی اب شکایت کیا کریں

ہر چند کہ ہوں موردِ الزامِ محبّت
اے دوست مگر میری خطا کوئی نہیں ہے
اس دورِ کم احساس میں میری طرح شاید
شرمندۂ انجامِ وفا کوئی نہیں ہے

...

بے نیاز اپنی ہی ہستی سے اگر ہو جائے
دل کا عالم ہی بہ انداز دگر ہو جائے
ننگ ہے شرحِ محبّت کا تقاضہ اے دل
آہ وہ آہ جو محتاجِ اثر ہو جائے

...

جو چاہے وہ کرے نگۂ دل نواز دوست
میرے دلِ حزیں کا تقاضہ کوئی نہیں
وہم و گماں کی ہلکی سی کچھ جھلکیاں سہی ہیں
پیشِ نگاہِ شوق تماشہ کوئی نہیں

...

آنکھوں میں اگر جذب ہے اور کیف ہے دل میں
ہر جلوۂ حسن اپنی جگہ ہوش ربا ہے
افکارِ پریشاں کی ہے اک یورشِ پیہم
ہر وقت دل و جاں میں اک حشر بپا ہے

...

وہ پہلے پہل اُن کی نگاہوں سے تصادم
اس حادثۂ دل کا ابھی تک ہے مزہ یاد

مانا سکونِ قلب ہے سرمایۂ حیات
فرصت کہاں کہ اس کی تمنا کرے کوئی

نیرنگِ ہست و بود میں گُم ہو گیا ہوں میں
ڈھونڈا کرے گی گردشِ شام و سحر مجھے

للہ الحمد ذکر اُن کا دل کی تسکین کے لئے
مختلف عنوان سے وردِ زباں ہے آجکل
زندگی اپنی کبھی تھی مثل موجِ بوئے گل
ایک اک لمحہ مگر بارِ گراں ہے آج کل

بادۂ نرگسِ مخمور سے کر دے مدہوش
عارفی تشنہ لب و تشنہ جگر ہے ساقی

ملی فُرصت نہ دَم بھر کو کہ کچھ تو سوچتے آخر
یہ اپنی زندگی کیا اور مآلِ زندگی کیا ہے

اے خیالِ دوست رہنے دے یونہی بیخود مجھے
جانے کیا عالم ہو میرا ہوش میں آنے کے بعد

مَیں ہوں اس بحرِ حوادث میں وہ موجِ بیقرار
زندگی جس کے لئے ساحل سے ٹکرانے میں ہے

یورشِ افکارِ پیہم، سانحاتِ نو بہ نو
عارفیؔ پھر بھی مگر خوابِ گراں ہے زندگی

جب تلک دل میں نہ ہوں جذباتِ تسلیم و رضا
ہے بہت صبر آزما سود و زیانِ زندگی

توڑنا توبہ کا سو بار بھی آساں تھا مجھے
جامِ مَے مجھ سے تو اک بار بھی توڑا نہ گیا

محبت بے نیازِ کیف و کم وجدانِ فطری ہے
محبّت جو رہینِ آرزو ہو وہ محبت کیا

کرو گے یاد جب باتیں کرو گے
کہ کوئی رفتۂ بسیار گو تھا

کلامِ فارسی

زمزمہ سنج است یادِ دوست با مضرابِ دل
دارم اندر خلوتِ جاں ہم نوائے خویشتن

چوں گذشتم در رہِ اُو ماورائے خویشتن
یافتم بابِ حریمش وا برائے خویشتن

اے زہے جذبِ محبّت من فدائے خویشتن
حُسن افگندست بر عشقم ردائے خویشتن

در دلم ہیجان عشق و بر لبم ناموسِ عشق
بر نمی تابم کہ گویم ماجرائے خویشتن

بازگشتِ ذوقِ من بُود آنچہ بود از مہرِ دوست
می شنودم زیر گنبد خود صدائے خویشتن

زمزمہ سنج است یادِ دوست با مضرابِ دل
دارم اندر خلوتِ جاں ہم نوائے خویشتن

من چگونہ آورم عرض تمنّا پیشِ دوست
می نیرزد ورنگاہم خود وفائے خویشتن

لذّتِ دردِ دلم از ماسوا بیگانہ داشت
نالہائے خویشتن دارم برائے خویشتن

در خورِ پیمانۂ ذوقم نہ بودہ بادۂ
سازم از افشردۂ دل بادہ ہائے خویشتن

ہاں بکن جان و دلم را غارتِ ناز و ادا
جاں فدایت تیز ترکُن دشنہ ہائے خویشتن

تا نیابد شورشِ ہستی سُراغت بعد ازاں
اے دلِ وارفتہ گم شو در فضائے خویشتن

بہرِ تسکینِ دلِ آشفتۂ خود عارفی
می سرایم شعرِ خود در نالہائے خویشتن

مُہلتم دِہ از تپش ہا ساعتے — ساعتے اے دل خدارا ساعتے
کاش تسکینِ دلِ مضطر شوی — لحظۂ یا لمحۂ یا ساعتے
عالمِ بُود و نبودہ عالمے — ما و تو بودیم تنہا ساعتے
ہر نفس خوں گشتہ می آید بلب — در غمت بگذشت بر ما ساعتے
مست و بیخود کن مرا از یادِ دوست — دور کُن ایں جام و صہبا ساعتے
لقمۂ از نکہتِ آں گل بیار — اے نسیمِ کیف افزا ساعتے
رہنما شو تا حریمِ نازِ دوست — اے شہِ اشرفؒ خدا را ساعتے
از کرمہائے تُو اُمیدے برم
یاد آری عارفی را ساعتے

○

تیز کُن سُوزِ نواہا اندکے — آتشیں کُن نالہ ہا را اندکے
اندکہ در بزمِ شُوریدہ دلاں — نعرہ ہائے ہاؤ ہُو ہا اندکے
محفلِ اہلِ خرد برہم بزن — فاش کُن راز جنوں را اندکے
ناشناسِ راز را کُن راز داں — شرح کُن دردِ نہاں را اندکے
تا درِ میخانہ بکشا بند باز — گو حدیثِ جام و صہبا اندکے
می سراید راز ہائے میکدہ
ہوش چوں شُد عارفی را اندکے

(کراچی ۱۹۵۶ء)

می دہد حسنش فریبِ نوز پیمان دگر — می کند عشقم نثارش عالمِ جانِ دگر
در غم تو می طپد دل بے نیازِ سوز و ساز — رُوح را بالیدہ می دارم بو جدانِ دگر
می نماید نفس حیلہ ساز نیرنگِ ہوس — توبہ ام از جا رود وردِ ذوق عصیانِ دگر
از نگاہِ کم مبیں اے منعمِ ظاہر پرست — بے سر و سامانیم را ہست سامانِ دگر
نالہ می جوشد چو بکشائم لبِ مجبورِ خود — در نصیب ہر گز نشستم نیست عنوان دگر

عارفی پیر مغانم بادۂ غم سوز داد
یافتم از کیف آں روح دگر جانِ دگر

(ہردوئی ۱۹۳۱ء)

○

باز اے کافر نظر صبرم شکن — تاب و ہوشم درہم و برہم شکن
لذتے خواہی اگر از سوزِ غم — نالہا در دل کش و دبہم شکن
دردہا در جانِ زادم ریختی — ایکہ حشمت می تواں شد غم شکن
پُر کن از صہبائے غم پیمانہ ہا — رو بسنگِ عیش جامِ جم شکن

ناز ہا دارم بضبطِ اضطراب
جلوہ افروز و تمکینم شکن

(ہردوئی ۱۹۲۴ء)

خوابِ دوشنبہ

فسونِ شوق

دوش آں مست تغافل چو بخواب آمد پدید
با ہزاراں آرزو دل کامیاب آمد پدید

بر قدمش گاہ جان و گاہ دل کردم نثار
چو حصول مدعا را فتح یاب آمد پدید

گفتمش اے ماہ خوبی حیرت اندر حیرت است
در شب یلدائے من چوں آفتاب آمد پدید

راہ گم کردی مگر در کلبۂ احزانِ من
یا فغانم در فراقت مستجاب آمد پدید

یک تبسم کردہ چشم خویش را بر پا فگند
بر جبینش از حیا رنگِ گلاب آمد پدید

گفت ایں از جذب و تاثیر فغاں ہائے تو بود
در دلم یک گونہ درد و اضطراب آمد پدید

آمدم بہر تلافیٔ تغافل ہائے خویش
گرچہ از تمکین حسنم صد حجاب آمد پدید

انچہ از من بر تو جور نا مناسب رفت رفت
شاد زی اکنوں کہ عشقت کامیاب آمد پدید

من نمیدانم کہ بر من ایں سخنہائش چہ کرد
بر منِ وا رفتہ یکسر انقلاب آمد پدید

گردِ شمع حسن او پروانہ ساں کردم طواف
از وفورِ شوق در دل پیچ و تاب آمد پدید

من ہماں بودم کہ ناگہ چشم خوابم باز شد
آہ بر جانم مجوزاں چہ عذاب آمد پدید

(علی گڑھ ۱۹۲۲ء)

تاریخ ولادت حضرت ڈاکٹر عبدالحئ عارفی

صبحِ صادق روزِ سہ شنبہ ہشتم بود از ماہِ نخست — بختِ نکو داد وقتِ مبارک شاہد داد عبدالحئ
عمرِ طویل و علمِ وسیع و دولتِ دینش حق بدہاد — ہست بجا تاریخش کاظم فرخ باشد عبدالحئ

۱۳۱۲
۴
۱۳۱۶ھ

مادۂ دیگر

فجر ہشتم محرم

۱۳۱۶ھ

(ماہ نخست = ماہِ محرّم کہ اوّل ماہِ سال اسلام ست)

فرمودہ مولوی کاظم حسینؒ جدامجد حضرت عبدالحئؒ

تواریخ وصال

۱ - فرخ باشد محمد عبدالحئؒ = ۱۴۰۶ھ
۲ - فرخ شدہ محمد عبدالحئؒ = ۱۴۰۶ھ
۳ - قطب الارشاد و عارف باللہ عبدالحئ واصل باللہ بود = ۱۴۰۶ھ
۴ - مولوی عبدالحئؒ صاحب خلد آشیاں = ۱۴۰۶ھ
۵ - قطب الارشاد عارف باللہ سیدنا حاجی مولوی عبدالحئؒ صاحب عارفی = ۱۴۰۶ھ

— نتیجۂ فکر —

سید علی حماد رضا صاحب مدظلہٗ - کراچی

تاریخ اشاعت "صہبائے سخن" طبع اوّل

۱ ۔ شرابِ گلفامِ سخن = ۱۳۸۴ھ
۲ ۔ نغمۂ محرم = ۱۳۸۳ھ

(فرمودہ حضرت بابا نجم احسن نگرامیؒ)

تاریخ اشاعت "صہبائے سخن"، طبع دوم (بہ ترتیبِ جدید)

۱ ۔ اک ساغرِ بادۂ باقی = ۱۴۰۸ھ
۲ ۔ مینا میخانۂ صہبائے سخن عارفی = ۱۹۸۸ء
۳ ۔ میخانۂ صہبائے سخن عارفی صاحب = ۱۹۸۸ء
۴ ۔ تاریخ اشاعت صہبائے سخن و بادۂ باقی ز کلام عارفی = ۱۴۰۸ھ
۵ ۔ صہبائے سخن بادہ کلام عبدالحئی عارفی = ۱۴۰۸ھ

۔ نتیجۂ فکر ۔
سید علی حماد رضا صاحب مدّظلہٗ
کراچی